

TIGHT BINDING BOOK

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_222691

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No.

Accession No.

Author

Title

This book should be returned on or before the date
last marked below.

بہترین ادب

گوئی طرح نمونہ ۹ سیر

ترتیب دینے والے :-

غلام ربانی تاباں
گویاں متل
کمال احمد صدیقی

اور

پیرکاش پنڈت

مکتبہ شاہراہ • دہلی

پہلی بار

چاندو پے

قیمت

(کھنڈیستو پریس دہلی)

عوام کے نام

ترتیب

مقالات

۱۱	احتشام حسین	حالی کے سیاسی شعور کا تجزیہ
۲۴	سرام بلاس شرمہا	ہندی، اردو، ہندوستانی کا مسئلہ
۲۵	عبد العلیم	ترقی پسند ادیب آج کیا کریں؟
۵۹	محمد حسن	ادب، زندگی اور سماج
۶۷	ممتاز حسین	ماضی کے ادب غالبہ سے متعلق

منظومات

۹۳	احمد ریاض	دوسری دیوار چین
۹۵	احمد ندیم قاسمی	دقت
۹۸	اختر الایمان	جنگ
۱۰۱	اسرار الحق مجاشر	آج
۱۰۳	افضل پرویز	حکمران کی ساحری
۱۰۶	بلراج کومل	جنگ
۱۰۸	تاجور ساموی	غزل
۱۰۹	تخت سنگہ	لال سویرا
۱۱۱	جان نثار اختر	تاب سخن
۱۱۲	جمیل ملک	انتظار

۱۱۳	چرخ کسب آبادی	گل آدم
۱۱۴	جوش ملیح آبادی	شاندار دعویٰ
۱۱۶	حامد عزیز مدنی	پچھلے پیر کا چاند
۱۱۸	حسن اعرافی	سہاگے کا گیت
۱۲۶	خاطر غزنوی	گیت
۱۲۸	خلیل الرحمان اعظمی	اجنبی سائے
۱۳۰	ساحر لدھیانوی	شکستِ زنداں
۱۳۲	سردار جعفری	جیل
۱۳۴	شاد عارفی	التوا سے اجرا تک
۱۳۷	ظہیر کاشمیری	پانگلو!
۱۳۸	عبد الحمید عدم	غزل
۱۳۹	غلام ربانی تاناہ	جیل میں کسی کا خط پا کر
۱۴۰	فراق گورکھپوری	بزمِ برشکال
۱۴۱	فکر تونسوی	بوڑھ وازی
۱۴۳	فیض احمد فیض	شورشِ برباد و نئے
۱۴۶	قلیل شغائی	غزل
۱۴۷	کمال احمد صدیقی	خلوت سے انجن تک
۱۵۶	کیفی اعظمی	ٹرنک کال
۱۵۸	گوپال متل	صنع کا ذب
۱۵۹	مجر و ح سلطان پوری	غزل

۲۶۱	مجید امجد	ایک کوہستانی سفر کے دوران میں
۱۶۲	محمود خاں ندھری	اودھ کی دوکان بھیکا پکوان
۱۶۶	مسعود حسین	غزل
۱۶۷	معین احسن جڈ پی	غزل
۱۶۸	ملک حمید	ایک نظم
۱۷۱	منیب الرحمان	رات ساکت ہے
۱۷۳	میراجی	غزل
۱۷۴	ن، م، مرشد	ایران میں اجنبی
		افسانے مخار کے
۱۸۱	ابراہیم جلیس	جاوید
۱۹۱	پرکاش پٹل	منطوق
۲۰۱	شوکت صدیقی	تانتیا
۲۱۹	ہمیت چغتائی	کیدل کورٹ
۲۳۳	فکر تونسوی	میر سے پیار سے ابا!
۲۴۶	کرشن چندر	مہا لکشی کا پل
۲۶۷	کنہیا لال کپور	شن شن شان
۲۷۴	صہد رانا	صبح دوپہر شام
۲۸۶	ہنس راج مرہار	ماحول

پیش لفظ

۱۹۴۹ء کے ادیب انتخاب آپ کے سامنے ہے۔ ہم لوگوں نے اپنے طور پر اس امر کی انتہائی کوشش کی ہے کہ یہ انتخاب زیادہ سے زیادہ نمائندہ ہو۔ اچھے کھنے والوں کا نہیں بلکہ اچھی چیزوں کا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ صرف مشہور رسائل کی ورق گردانی پر اکتفا نہ کی جائے بلکہ ہند اور پاکستان کے تمام ترقی پسند ہفت روزہ جرائد پر بھی نظر ڈالی جائے یہ کوشش بیکار نہیں گئی اور اس طرح ہمیں بعض ایسی اچھی چیزیں مل گئیں جو بصورت دیگر ہماری منظروں سے اوجھل رہتیں۔

انتخاب کے وقت ہم نے ہند اور پاکستان میں کوئی امتیاز نہیں کیا اور ہر پاس فیصدی کے اصول پر عمل کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا کیونکہ جہاں تک اردو ادیب کا تعلق ہے یہ ایک قابل تقسیم درجہ ہے تخلیقی ادب پر ہندی یا پاکستانی چھاپ نہیں لگ سکتی سارے ادیبوں کی یہ بڑی ہی خوش نصیبی ہے کہ وہ اس معاملہ میں سرخرو رہے اور ان کے اس ملکی یا ملی تعصب کے دھبوں سے پاک ہے۔ اگر تمام تر غیر جانبداری کے باوجود اس انتخاب میں ہندوستانی ادیبوں کے نگارشات کا تناسب زیادہ ہے تو اس کی وجہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کہ اچھا لکھنے والوں کی تعداد ہندوستان میں زیادہ ہے اور ان کی تخلیقی سرگرمیوں کی رفتار بھی مدہم نہیں پڑی۔ اس بات سے ہم بجا طور پر خوش ہیں۔ البتہ ان "خوش فہموں" کو اس سے ضرور مایوسی ہوگی جو بزمِ خوشیہ سمجھ نیٹھے تھے کہ ہندوستان سے اردو کا خاتمہ ہو گیا۔ ان لوگوں کو کون سمجھائے کہ زبانیں اس طرح نہیں مٹا کرتیں۔

ادھر پاکستان میں بھی اردو کے ادیبوں کی سرگرمیاں ہر لحاظ سے اطمینان کا موجب ہیں۔ ان لوگوں نے ثابت کر دیا کہ شجرِ اردو کے نئے ہر زمین ساز نگار ہے۔ تقسیم ہند کے بعد جہاں ایک گردہ کو ہندوستان میں اردو کا مستقبل محذوٰش نظر آتا تھا وہاں دوسرا گردہ اس تشویش میں مبتلا تھا کہ اردو پاکستان میں شاید ہی پنپ سکے۔ ہمیں خوشی ہے کہ ان دونوں گردہوں کے اندیشے غلط ثابت ہوئے اور اردو ہند اور پاکستان دونوں کے عوام کی چھیتی بنی رہی۔

دوسری زبانوں کے ادیبوں کے ساتھ اردو ادیبوں نے بھی اپنے دور کے سماجی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی پوری پوری کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بڑی ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے۔ ۱۹۴۹ء کو اس سلسلے میں یادگار سال ہے۔ ہمارے کتنے ساتھیوں کو اس سال جیل میں ٹھونس لیا گیا۔ مگر قید و بند کی مصیبتیں اور حکومت کی سختیاں ان کے عزم کو تیز نزل نہ کر سکیں۔

یہ انتخاب اس لحاظ سے اور بھی سفید ہے کہ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارا کاروانِ ادب کس رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے اور اب کونسی منزل میں ہے۔

سُرخِ خارِ مُغیلاں یہ پتہ دیتی ہے
کہ یہاں سے ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

مقالات

احتشام حسين

دراهم بلاس شرمه

عبد العليم

محمد حسن

مهتاز حسين

دام بلاس شو ما

ہندی۔ اردو۔ ہندوستانی کا مسئلہ

ہندی، اردو، ہندوستانی کا مسئلہ یہ ہے کہ ان میں سے کون سی یا کتنی زبانیں ہندوستان کی قومی زبان بنائی جائیں۔

صرف ہندی کو اس علاقہ کی زبان بنانے کی تائید میں یہ دلیلیں دی جاتی ہیں۔
 ”ہندی ایسی زبان ہے جسے عوام بولتے اور سمجھتے ہیں۔ یہ صرف ہندوؤں کی زبان نہیں ہے بلکہ
 اسے مسلمان عوام بھی سمجھ سکتے ہیں۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اس میں فارسی کے لفظ ملا دیئے
 اور اس انداز تحریر کو وہ اردو کہنے لگے۔ یہ بالکل غیر ملکی زبان ہے اور اس سے ہم کوئی واسطہ
 نہیں رکھ سکتے۔“

ہندی کے وہ حامی جو زیادہ رجعت پرست ہیں وہ یہ کہتے ہیں کہ ہندی ہندوؤں کی
 زبان ہے جس کی بنیاد ہندو کلچر اور ہندو مذہب پر ہے اس لئے ہندی اور اردو دونوں
 ان دونوں کی زبان نہیں ہو سکتیں۔ جن کا مذہب ہندو مت اور اسلام ہے۔

چونکہ قوم کی بنیاد مذہب پر نہیں رکھی جاسکتی اس لئے یہ ناممکن ہے کہ ایک قوم دو
 زبانیں بولے۔ استاتن نے قوم کی جو تعریف کی ہے اس سے بات بالکل صاف ہے

کہ ہر قوم کی ایک مشترکہ زبان ہونی چاہئے۔ استمالن نے آگے چل کر یہ بھی بتایا ہے کہ اگرچہ ہر قوم کی ایک مشترکہ زبان ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ دو قومیں ایک زبان نہ بولیں۔

”ہر قوم کی ایک مشترکہ زبان ہوتی ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر قوم کی الگ الگ زبان ہو۔ لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ ایسی دو قومیں نہیں ہو سکتیں جو ایک ہی زبان بولتی ہوں۔ انگریز اور امریکی ایک ہی زبان بولتے ہیں، لیکن دونوں ایک قوم نہیں ہیں۔ یہی بات ناروے اور ڈنمارک کے لوگوں اور انگریزوں اور آئرلینڈ کے لوگوں کے لئے شکیں۔“
(دارکسٹرم اور سلسلہ قومیت)

استمالن کی اس بات سے کہ ”ایسی کوئی قوم نہیں جو ایک ہی وقت میں کئی زبانیں بولتی ہو“ ہمیں ہندی، اردو، ہندوستانی کے جھگڑے کو طے کرنے میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ اگر ان زبانوں کے بولنے اور لکھنے والے ایک سے زیادہ قوموں سے تعلق نہیں رکھتے تو یہ ظاہر ہے کہ ان کے آپس کے اختلافات قومی اختلافات نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں زبانیں بولنے والے ایک ہی قوم کے ہیں اور اس لئے یہ بھی ضروری ہے کہ یہ تینوں زبانیں بنیادی طور پر ایک ہی ہوں۔

ہندی اور اردو بنیادی طور پر ایک ہی زبانیں ہیں، اس لئے کہ دونوں کی بنیاد عوام کی بول چال کی زبان پر ہے اور دونوں اس سے بھاگ کر نہیں جاسکتیں۔ اسے عام بول چال کی ہندوستانی کہیں یا کچھ اور، اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات اپنی جگہ قائم ہے کہ ہندی یا اردو کا ایک جملہ ہم اس وقت تک نہیں لکھ سکتے جب تک کہ ہم اس ڈھانچہ کو استعمال نہ کریں جو عوام کی بات چیت کا ہے۔

استان نے اس بات کو اچھی طرح صاف کر دیا ہے کہ جب ایک قوم کے عوام کی مشترکہ زبان کا ذکر کیا جاتا ہے تو اس سے مراد ان کی بات چیت کی زبان ہوتی ہے، انھوں نے لکھا ہے:-

”آسٹریا میں چک قوم کا رہنا اور پول قوم کا روس میں رہنا ناممکن ہو جائے اگر ان دونوں قوموں کی اپنی اپنی مشترکہ زبان نہ ہو، اسی کے ساتھ روس اور آسٹریا کے ایک دوسرے میں ضم ہونے میں اس لئے رکاوٹ نہیں پڑ سکتی کہ ان میں کئی مختلف زبانیں بولی جاتی ہیں یہاں ہم ظاہر ہے کہ لوگوں کی بول چال کی زبان کا ذکر کر رہے ہیں نہ کہ حکومت کی سرکاری زبان کا۔“

عوام کی بول چال کی زبان ہندی اور اردو میں بانٹی نہیں جاسکتی ہندوستانی قوم کی جنتا کی بول چال کی زبان ایک ہی ہے

اردو کے حامی یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اردو جنتا کی زبان ہے اور ان کی دلیل صرف اس حد تک ٹھیک ہے جہاں تک وہ یہ کہتے ہیں کہ ہندی کا تصور اس بول چال کی زبان کے بغیر ناممکن ہے جس پر اردو کی بنیاد ہے۔ جہاں تک ہندوستانی کے حامیوں کی دلیل کا تعلق ہے وہ اس حد تک ٹھیک ہے جہاں تک وہ اس کا مستند عوام کی بول چال کی زبان سے دکھلاتے ہیں۔

لیکن ہندی اور اردو دونوں زبانیں ایک نقطہ کے بعد اپنی بنیاد یعنی بول چال کی زبان کا دور رہٹ جاتی ہیں۔ یہی حال ہندوستانی کا ہوتا ہے جب وہ دونوں میں ایک زبان سمجھی جاتی ہے یا دونوں کو ملا کر اس کا نام ہندوستانی لکھا جاتا ہے۔ اس طرح ہندی اور اردو کی بنیاد اگرچہ ایک ہے لیکن دونوں کا ڈھانچہ الگ الگ ہے۔ ہمیں اس کا پتہ چلانا چاہئے کہ اس

فرق کا سبب کیا ہے ؟

ہندی اور اردو میں یا بول چال کی ایک ہی زبان کے دو اسٹائلوں میں فرق کا پہلا سبب تو یہ ہے کہ برطانوی سامراج کی حکمرانی کے دور میں ہمارے عوام کی سماجی ترقی نہایت غیر مساوی طور پر ہوئی ہے ۔

ہندوستان پر برہمنی سرمایہ چھائے رہنے کی وجہ سے جنتا کی سماجی اور کلچرل ترقی میں بڑی سخت رکاوٹ پڑی۔ اس لئے کہ سامراج نے ایک طرف جاگیرداروں کو اپنا ساتھی بنا کر اسے باقی رکھا۔ دوسری طرف ہندوستانی صنعتوں کی ترقی کو روکا۔ معاشی طور پر عوام کو نہایت بے دردی سے لوٹا۔ اپنے مفاد کے لئے چھوٹے کسانوں کی معیشت اسی طرح باقی رکھی۔ زمینداروں کی شکل میں اپنے لئے ایک سماجی بنیاد پیدا کی۔ لوٹ کے لئے جنتا کو کلچرل طور پر بالکل پسماندہ رکھا۔ عوام پر ایک غیر ملکی زبان لاو دی۔ جہاں تک ممکن ہو سکالوگوں کی اپنی زبانوں اور کلچر کو دبایا اور ترقی نہیں کرنے دی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس سامراج نے ہندوستان کے غذا پرے سرمایہ دار سے سمجھوتہ کر لیا تاکہ دونوں ملکر اس ملک کو لوٹیں۔ اس کا اثر کلچر اور زبان کے میدان میں بالکل صاف ظاہر ہے۔

جنتا اپنا طبقہ داری اتحاد زبان کے میدان میں حاوی نہیں کر سکی۔ مغربی تعلیم، زبان اور ادب نے دانشوروں پر جو اثر ڈالا وہ صرف اعلیٰ طبقوں تک محدود رہا۔ عام جنتا کو اس موقع ہی نہیں ملا کہ وہ اپنے سامراج دشمن۔ جاگیردار دشمن اور سرمایہ دار دشمن نقطہ نظر کو کلچرل سٹیلوں میں موثر بنا سکتی۔ اس کے برعکس برطانوی سامراج نے رائے بہادروں، رائے صاحبوں، خان بہادروں اور دوسرے خطاب یافتہ لوگوں کی ایک فوج تیار کر لی، جو

ہندی اور اردو ادب کے لیڈر بن گئے ہیں۔ ہندی اور اردو کی ترقی میں بھی انھوں نے اپنے عوام دشمن اور سامراج دوست نقطہ نظر کو داخل کر دیا۔

برطانوی سامراج کے زیر سایہ نظام حیدر آباد مسلم کلچر اور اردو کے، اور بیکانیر اور اور بھرت پور وغیرہ کے راجہ ہندو کلچر اور ہندی بلکہ سنسکرت کے سرپرست بن گئے۔ ہمارا راجہ اور اردو ڈاکٹر کاٹھو (گورنر بنگال) اس کے حامی ہیں کہ سنسکرت کو ہندو کی قومی زبان بنایا جائے۔

برطانوی سامراج نے زبان و کلچر میں راست اور بالواسطہ طریقہ پر اپنے ساتھیوں کی مدد سے خلت کی۔ سیاست کی طرح اس میدان میں بھی اس کی براہری کو شش رہی کہ ہندوستان کے ہندو طبقہ کو مذہب کی بنیاد پر دو حصوں میں بانٹ دے۔ چنانچہ وہ زبان اور ادب میں بھی مذہبی جھگڑے پیدا کرتا رہا۔ اس کے ذریعہ زبانوں کے ماہروں نے بڑے بڑے سائنٹیفک نظریے پیش کئے کہ زبانوں کی بنیاد نسل اور مذہب پر ہے۔

زبان کے ان سولہ ماہروں میں سب سے اہم گریسن تھے۔ ہندوستان کے خزانے سے انھیں اور ان کے ماتحتوں کو تیس سال تک روپیہ ملتا رہا کہ ہندوستان کی زبانوں کی تفصیلی جائزہ لیں۔ اتنی طویل مدت تک محنت و مشقت کے بعد گریسن اس نتیجہ پر پہنچے :-

(۱) ”ملک کے بڑے حصے میں جس میں راجپوتانہ، وسطی ہندوستان اور گجرات بھی شامل ہیں۔۔۔ ہر جگہ ہندی یا ہندوستانی دفتری زبان کے طور پر رائج ہے۔۔۔ کوئی شخص بھی جیسے ذرا سی سمجھ ہے کسی زبانیں رائج کر کے انتظام میں لکھنیں نہیں پیدا کرے گا“

”ہندوستانی زبان کا سرو“ (تمہید صفحہ ۲۳)

(۲) ہندو آریائی زبانیں، قبائلی زبانوں (مثلاً جن کا تعلق دراوڑوں، منڈو اور تبتی برمن

وغیرہ سے ہے) کی جگہ لیتی جا رہی ہیں۔“ (ایضاً صف ۲۹)

(۳) اسلام نے اردو کو دور دور پھیلا دیا ہے۔ ہمس ملک میں ایسے مسلمان باشندے ملتے ہیں جن کی زبان وہ نہیں ہے جو ان کے دوسرے مذہبوں کے ساتھیوں کی ہے۔ بلکہ وہ ہمیشہ دہلی اور لکھنؤ کے محاورے استعمال کرنے کی کوشش (اگرچہ بہت محدود طریقہ پر) کرتے ہیں۔“ (ایضاً صف ۳۰)

(۴) صرف مسلمانوں کے اردو کے جملوں میں لفظ اس طرح آتے ہیں جس طرح فارسی میں آتے ہیں (۱۳۳) اور

(۵) ملک کے لوگوں میں زبان کی غیر ملکی ساخت کا اتنا سخت احساس ہے کہ ہندوؤں اور وہیسی بول چال کی زبان (جو ہندوستانی کی ایسی شکل ہے جس میں فارسی ملی ہوئی ہے) کو اس کے الفاظ کی بنا پر نہیں جانچتے بلکہ اس بنیاد پر کہ اس میں الفاظ آتے کس ترتیب سے ہیں۔“

زبان کے اس جائزے میں اور خاص کر اس کی تمہید میں ایسے بے شمار جواہر پا کر ملتے ہیں۔ اس سے یہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہ گریسن کے زبان کے تجزیہ کی طبقہ داری بنیاد کیا ہے وہ اس سلسلہ کو بالکل ساحرا جیوں کی طرح دیکھتا ہے جو نظم و نسق کے مفاد میں کم ترقی یافتہ قوموں کی زبان کو دوبانا چاہتا ہے۔ بالکل یہی بات آج کل ہندوستان کے بڑے سرمایہ دار دہرا رہے ہیں۔ گریسن نے بڑی بے شرمی کے ساتھ یہ لکھا ہے کہ اسلام نے اردو کو کوٹنے کوٹنے میں پھیلا دیا اور یہ تاریخی حقیقت بھلا دی کہ اردو اسلام کے پیروؤں کے ہندوستان میں آنے اور بسنے کے بعد پیدا ہوئی اور اس نے ترقی کی۔ اس کے علاوہ معلوم نہیں کہ گریسن اس کی وجہ کیوں نہ بتا سکے کہ مسلمانوں نے اردو کو

صرف ہندوستان ہی میں پھیلا یا اور دوسرے ملکوں مثلاً مصر، الجزائر، ترکی اور عرب وغیرہ میں نہیں لے گئے۔ گریسن کے سامنے ایک سوال یہ بھی تھا کہ آخر ہندوؤں کی اتنی بڑی تعداد اردو کو اپنی بول چال کی زبان کیسے بنالیا۔ اس کا جواب انھوں نے دیا ہے اور اس کے لئے انھوں نے ایک اور انکشاف کیا وہ یہ کہ مسلمان اردو لکھتے وقت الفاظ کی ترتیب فارسی طریقہ پر رکھتے ہیں اور ہندو سنسکرت کے طریقہ پر؟

گریسن کی اس رپورٹ نے ہندوستان اور ماہر کی زبانوں کے بورڈز ماہروں پر جو زبردست اثر ڈالا اس سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ زبان کے مسئلہ میں سامراجی غلطی سے کتنا زبردست نقصان پہنچا ہے اس کے اثرات ابھی تک باقی ہیں اور اسے مٹانا ہو گا۔ برطانوی سامراج نے جاگیرداروں کو اپنے دوست کی حیثیت سے باقی رکھا اور ان کی حفاظت کی۔ اچیا پرستی جاگیردار طبقہ کی خاص آسٹیا لوجی ہے۔ جاگیردار طبقہ نے جب کبھی قومی زبان اور ادب میں مداخلت کی تو وہ لازمی طور پر رجعت پرستی اور اچیا پرستی کے تصورات بھی لایا۔ اس نے مذہبی فرقہ داری اختلافات کو ہوا دینے میں مدد دی اور بورڈز طبقہ اسے آڑ بنا کر طبقہ داری اختلافات کو چھپانا چاہتا ہے۔

برطانوی سامراج نے ہندوستان کی ہر قوم کو مختلف صوبوں اور ریاستوں میں بانٹ دیا۔ اس کی وجہ سے بعض قومیں سیاسی اور کلچرل طور پر متحد نہ ہو سکیں۔

ہندوستانی عوام کی اور ہندوستانی بولنے والے علاقوں کی غیر مساوی کلچرل اور سماجی ترقی کے یہ نہایت اہم اسباب ہیں۔ ان سب چیزوں کی ذمہ داری برطانوی سامراج پہنچا۔ ہندوستانی سرمایہ دار طبقہ کی پالیسی بھی اس کی ذمہ دار ہے کہ جتنا کی مشترکہ سیاسی کلچرل ترقی جمہوری بنیاد پر نہیں ہو رہی ہے۔ ہندوستان کے قومی لیڈر

جب سامراج سے ملے نہیں تھے اور کبھی اس کی مخالفت کرتے اور کبھی سمجھوتہ تو اس وقت وہ مشترکہ زبان اور کلچر کی بات کہا کرتے تھے۔ جس کی بنیاد مذہب پر نہیں بلکہ قومیت پر رکھتے تھے۔ بعض اس کی تائید کرتے تھے کہ ہندوستانی کو قومی زبان بنایا جائے اور یہ دونوں رسم الخط (لیپی) میں لکھی جائے۔ ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ پورے ملک کے لئے ایک قومی زبان کے مطالبہ کی طبقہ داری بنیاد کیا ہے۔ اب دیکھیں گے کہ صرف ہندوستانی علاقہ میں مشترکہ کلچر اور زبان کی ترقی میں انھوں نے کیا حصہ لیا۔

ہندوستان کے قومی لیڈر مشترکہ کلچر اور زبان کی باتیں تو خوب بنایا کرتے ہیں لیکن ہر طریقہ پر کوشش اس کی کرتے ہیں کہ اس کی بنیاد جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سامراج سے سمجھوتے کی پالیسی پر چل رہے ہیں اور جنتا کی جمہوری خواہشوں کے خلاف جا رہے ہیں۔ ایک طرف تو انھوں نے ہر موقع پر سامراج کے خلاف عوام کے انقلابی ابھار کو دبانے کی کوشش کی اس لئے کہ انھیں ڈرتھا کہ یہ انقلابی لہر نہ صرف بیرونی سامراج کو اڑا دیگی بلکہ ان کی طبقہ داری لوٹ کو بھی بہالے جائے گی۔ دوسری طرف کانگریس کے اندر اور اس کے باہر انھوں نے برابر اس کی کوشش کی کہ مزدوروں اور کسانوں کی طبقہ داری تنظیمیں نہ ترقی کرنے پائیں۔ حالانکہ یہی چیز پورے ہندوستان کے اتحاد، کسی قوم کے اتحاد، اور خاص طور پر زبان اور کلچر کے اتحاد کی ضامن ہے۔ سامراج سے سمجھوتہ بازی اور جنتا کی جمہوری جدوجہد کی مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستان کے لیڈروں نے نہ صرف ہندوستان کی تقسیم میں سامراج کا ہاتھ بٹایا بلکہ عوام میں تاریک پسندی اور شاذیت (جارجانہ قوم پرستی) کے جذبات پھیلائے۔ ایک طرف تو وہ یہ غماہ کرتے رہے انتہائی فاسٹ قسم کے رجحانات مثلاً آرم، ایس، ایس کے وہ مخالف ہیں۔ دوسری طرف خود انھوں نے انھیں کانگریس کے

اندر لے لیا۔ زبان اور کلچر کے سوال پر انھوں نے مشترکہ کلچر اور مشترکہ زبان کے نعرے لگانے بلند کر دیے۔ اور وہ کھلے طور پر بدترین احیاء پرستی اور فرقہ پرستی اور مذہبی جذبات کی تائید کرتے ہیں۔ عوام آج جو اپنے روزگار، جمہوریت اور کچی آزادی کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں اسے وہ پہلے سے کہیں زیادہ سختی سے کچلنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان کا سب سے پہلا ہلہ عوام کے سیاسی طور پر سب سے زیادہ بیدار حصہ پر ہے جو مزدور طبقہ کی رہنمائی میں جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ اس حملہ کو آگے اتنا بڑھا رہے ہیں کہ سوائے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے سب ہی اس کی زد میں آجائیں گے۔ اس پالیسی سے نہ تو مشترکہ زبان اور کلچر نے ترقی کی ہے اور نہ آئندہ ترقی کر سکتی ہے۔ اگر ان چیزوں نے پچھلے دور میں ترقی کی ہے اور آج ترقی کر سکتی ہیں تو بورژواؤں کی لیڈروں کی ان کوششوں کے باوجود ترقی کریں گی۔

صرف یہی نہیں۔ آج قومی لیڈر اس کوشش میں ہیں کہ عوام کو جمہوریت اور سوشلزم کی جدوجہد کے راستہ سے ہٹا دیں۔

زبان کا جھگڑا اور صوبوں کی تقسیم کے متعلق دوسرے جھگڑے اسی لئے اٹھائے جاتے ہیں کہ ان کی مدد سے عوام کو اصلی سماجی مسائل سے ہٹا دیا جائے۔ عوام میں بیوٹ ڈالنے کے وہ تمام بہت کمندے استعمال کئے جاتے ہیں جو سامراج استعمال کیا کرتا تھا، تاکہ عوام کی جاگیرداری، سرمایہ داری، لوٹ جتنے دن ممکن ہو باقی رکھی جاسکے۔ ان سے اس قسم کی کوئی امید رکھنا سخت حماقت ہے کہ وہ ان مسائل کے حل کرنے میں کوئی حصہ لے سکیں۔

کسی اور زمانہ کی نسبت آج کے دور میں صرف مزدور طبقہ اور اس کے ساتھی یعنی کسان اور محنت کش متوسط طبقہ کے لوگ ہی ایسے ہیں جو ہندوستان کی ہر قوم کے لئے مشترکہ کلچر اور مشترکہ زبان تعمیر کر سکتے ہیں۔

کیا اگرہ اور کان پور کی ملوں میں کام کرنے والے ہندو اور مسلمان مزدور دو زبانیں بولتے ہیں؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح یوپی کے کسان جو ایک ہی زمیندار کے ظلم کے نیچے کھیلے ہوئے ہیں ایک ہی زبان بولتے ہیں اور ایک دوسرے کی بات سمجھتے ہیں شہر کے درمیانی طبقے کے محنت کش و فرتوں اور اپنے محلوں میں ایک ہی زبان بولتے ہیں اور روزمرہ کی بات چیت میں انھیں کبھی کوئی دقت نہیں ہوتی۔

اسی طرح ہندو مسلم مزدوروں، ہندو مسلم کانوں اور ہندو مسلم درمیانی طبقوں کی اپنے اپنے علاقوں میں مشترکہ زبان ایک ہی ہے۔ اس زبان میں ممکن ہے کہ مقامی فرق ہو لیکن اس فرق کی بنیاد ان کے مذہب کی بنیاد پر نہیں ہے۔ یہ فرق آگے چل کر اس کے اوپر کھینچے میں پیدا ہوتا ہے۔ جب ہم اسے ادبی اور اعلیٰ کچھل ضرورتوں کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ ہندی اور اردو کا یہ فرق کہ وہ بنیادی طور پر ایک ہیں، لیکن ان کے اوپر کھینچے کھینچے الگ الگ ہیں، اس تضاد کا عکس ہے جو ہمارے سماجی ارتقا میں پایا جاتا ہے۔ یہ تضاد اس لئے آیا کہ قومی سرمایہ دار طبقہ کو سامراج نے ہندو سرمایہ داروں اور مسلم سرمایہ داروں میں بانٹ دیا اور جاگیر داری نظام اسی طرح باقی رہا سامراج نے جس عمل کو شروع کیا تھا سمجھوتہ پسند ہندوستانی بورژوازی نے اسے مکمل کیا۔ یہ تضاد ایک زبان کی ترقی میں حائل ہوا اور اس نے ایک ہی بنیادی زبان کے دو سٹائلوں یعنی اردو اور ہندی کی ترقی میں مدد دی۔

یہ کہنا کہ ہندی اور اردو دونوں ایک ہیں یا دونوں کا اوپر کا کھینچا ایک ہے یا دونوں کی ابتدائی بنیادی شکل یا ہندوستانی، اعلیٰ کچھل اور تعلیمی ضرورتوں کو پورا کر سکتی ہے حقائق سے آنکھیں بند کر لینا ہے اور اس تضاد سے منہ پھیر لینا ہے جو ہمارے

سامی ارتقا میں پایا جاتا ہے۔ تو پھر کیا یہ کہنا ٹھیک ہوگا کہ ہندی ہند و مذہب والوں کی اور اردو مسلمانوں کی زبان ہے ؟

یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا، اس لئے کہ دونوں کی ادبی اور کچھ روائتوں میں ایک مشترکہ جمہوری عنصر موجود ہے۔ یہی عنصر ایسا ہے جس کی بنیاد پر پول چال کی مشترکہ زبان ترقی کر کے اعلیٰ کچھول شکل اختیار کر لے گی۔

اگر اردو اور ہندی کو مذہب جدا نہیں کرتا تو پھر اور کون سی چیز جدا کرتی ہے ؟ ہندی اور اردو جس قدر پول چال کی زبان سے ہتی ہیں اسی قدر وہ ایک دوسرے سے بھی دور ہو جاتی ہیں۔ اس کی دوری کی بھی دو وجہیں ہیں۔ (۱) قدیم ہندوستان، ایران، یا عرب کی بعض ادبی روایتوں کی سختی سے پابندی اور (۲) سنسکرت، عربی اور فارسی لفظ کا استعمال ان کی ادبی شکل میں۔

دنیا کی کسی بھی جدید زبان کا اگر مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ قدیم مذہبی رسوم اور روایات کا اثر دن بدن گھٹتا جاتا ہے۔ پرانے تصورات اور روایتیں جو باقی رہ گئی ہیں ان کا مذہبی رنگ اڑ گیا ہے۔ مشترکہ زبان اور کچھول کی ترقی کے لئے زندگی کا مشترکہ ماحول نہایت ضروری ہے۔ اس لئے ایسے اثرات جو خالص ہندو یا فارسی یا اسلامی (مذہبی نقطہ نظر سے) ہیں وہ بتدریج ختم ہو رہے ہیں جیسے جیسے ان تصورات کو پھیلانے والے طبقے مرتے جائیں گے یہ بھی ختم ہو جائیں گے۔ پرانے قصے اور کہانیاں آج کل غیر مذہبی نقطہ نظر سے لہتی تحریریں بنی جا رہی ہیں اور ہم اپنے ملک کے ادیبوں میں اور خاص طور پر ہندی اور اردو کے بڑے ترقی پسند ادیبوں میں یہ چیز دیکھتے ہیں کہ ایک مشترکہ ادبی اور تہذیبی روایت موجود ہے۔ اس مشترکہ ادبی اور تہذیبی روایت کو عوامی

تھیں کی طرف سے خاص طور پر ترقی دی جا رہی ہے جو عام جنتا کے لئے ڈرامے تیار کرتا ہے حالات اسے خود مجبور کرتے ہیں کہ وہ مشترکہ تہذیبی ردائیوں کا سہارا لے۔

ہندی اور اردو کے دو ادبی روایتی اسٹائل ایسی بڑی رکاوٹ نہیں ہیں جو دور نہ کی جاسکے۔ اس طرح دو گننانیں ایک دوسرے سے مل کر ایک بن جائیں گی جب کہ بول چال کی مشترکہ زبان ترقی کر کے جنتا کی اعلیٰ تہذیبی ضرورتوں کے لئے استعمال ہونے لگے گی یہ ترقی خود جمہوری تحریک کی ترقی سے وابستہ رہے گی۔

سنسکرت یا فارسی عربی کی پابندی کا جہاں تک سوال ہے یا دوسرے لفظوں میں ادبی اور اعلیٰ ضرورتوں کے لئے پرانی زبانوں سے الفاظ لینے کا سوال ہے یہ اسی طرح حل ہو سکتا ہے کہ بول چال کی زبان بنے اور اس کے ترقی کرنے کے اصول کو ہم اس کی اعلیٰ منزلوں میں بھی برتیں۔

کیا ہندی اور اردو کی بول چال میں بھی سنسکرت یا عربی فارسی الفاظ کی پابندی کی جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا۔ جیسا کہ عمل سے ظاہر ہے۔ بول چال کی زبان میں جب کسی کلاسیکی زبان کے الفاظ لئے جاتے ہیں تو کیا اصول برتا جاتا ہے؟

۱۔ لفظ لیتے وقت اس بات کا خیال نہیں رکھا جاتا کہ جس طرح ان زبانوں میں استعمال ہوتا تھا اسی طرح استعمال کیا جائے۔

۲۔ صرف ایسے ہی لفظ لئے جاتے ہیں جو اس زبان کے لئے موزوں ہوتے ہیں، اور جو سنسکرت اور فارسی سے مختلف ہیں۔ یعنی پرانی زبانوں سے ہر لفظ نہیں لیا جاتا۔ صرف ایسا ہی لفظ لیا جاسکتا ہے جو اس بول چال کی زبان سے جو پرانی زبانوں سے مختلف ہے میل کھا سکے، اس میں ٹھیک بیٹھ سکے۔

۳۔ جو لفظ لئے جاتے ہیں اکثر ان کا تلفظ بھی بدل جاتا ہے۔ مثلاً سنکرت کا ”اگنی“
 اگ بن گیا اور ”مسودہ“ مسودہ بن گیا۔

۴۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جو لفظ لیا جاتا ہے اس کے معنی بھی بدل جاتے ہیں اور بالکل
 نئے معنی ہو جاتے ہیں۔

۵۔ اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ لفظ پرانی شکل میں باقی رہتا ہے ساتھ ہی اسے ایک نئی شکل
 اور نئے معنی مل جاتے ہیں۔ مثلاً ”چکرا“ سے ”چکر“ اور ”چتر“ سے ”چتر“ وغیرہ۔

۶۔ دوسری زبانوں سے الفاظ لئے جاتے ہیں تو اس کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ بول
 چال کی زبان میں خود اپنے اندر الفاظ بنانے کی صلاحیت ختم ہو جاتی ہے۔ یہ چیز خاص طور
 سے مزدوروں اور کسانوں میں ہوتی ہے وہ نئے سماجی حالات کے لحاظ سے زبان کو
 ترقی دینے میں غیر معمولی قابلیت دکھاتے ہیں۔

یہ چند اصول ہیں جو بول چال کی زبان میں کلاسیکی زبان سے فائدہ اٹھاتے وقت
 برتتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن ہے کہ عام استعمال کے ان قاعدوں
 کے خلاف چل کر ادبی ڈھانچہ بنایا جائے اور آئندہ کئی برسوں تک باقی رہ سکے۔

پچھلا تجربہ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ جب بھی اس قسم کی کوشش کی گئی وہ آخر میں ناکام ہوئی
 جب کبھی نئے طبقوں کے ہاتھ میں طاقت آئی تو انھوں نے کچلی ہوئی گنوار زبانوں کی ترقی
 کے لئے راستہ کھول دیا۔ بعض لوگ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ جنتا کی زبان اور ادبی زبان
 میں ہمیشہ فرق رہے گا۔ اور اس سے وہ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ بول چال کی زبان ممکن ہے کہ
 کچھ قاعدوں کی پابندی کرے۔ لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ یہی قاعدے ادبی زبانوں میں بھی
 برتے جائیں۔

اس دلیل کا جواب یہ ہے کہ اس قسم کا فرق اس لئے پایا جاتا ہے کہ اعلیٰ طبقوں اور عام جنتا کے کچھ میں فرق ہے اس کی بنیاد طبقہ داری فرق پر ہے۔ عوام جب جمہوریت اور سوشلزم کی طرف بڑھیں گے اور یہ فرق پیدا کرنے والے فرقے مٹ جائیں گے تو یہ تقریباً بھی مٹ جائے گی۔ یہ فرق آج ترقی پسند ادب میں بھی مٹا جاتا ہے۔ جب ہم اسے عوام کی جدوجہد کا ہتھیار بناتے ہیں اس کا اثر زبان پر بھی پڑتا ہے اس لئے کہ وہ دوسروں تک اپنے خیالات پہنچانے کا ذریعہ ہے۔

پچھلے دور میں لبرل بورژوا لیڈروں نے ہندی اور اردو کو ملائے کی کوشش کی لیکن وہ ناکام رہا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ زبان کے مسئلہ کو لبرل بورژوا طبقہ کے نقطہ نظر سے حل کرنا چاہتے تھے وہ سوال کو اس طرح سامنے رکھتے تھے کہ موجودہ ہندی اور اردو کو ملا دیا جائے۔ کیا مشترکہ زبان کو اس طرح پیش کرنے کا طریقہ صحیح تھا ہندی اور اردو کے رشتہ میں؟

سوال کو اس طرح سے پیش کرنے کا طریقہ غلط تھا۔ انھوں نے اس سماجی عنصر کو بھلا دیا جو بول چال کی مشترکہ زبان کو اعلیٰ کچھوں کی زبان بننے سے روکتا ہے اور زبان کی اعلیٰ کچھوں کی شکل کو حصوں میں بانٹنے کی کوشش شروع کی۔ انھوں نے اس مسئلہ کو جنتا کی سیاسی اور تہذیبی ترقی سے جوڑنے کی کوشش نہیں کی۔ انھوں نے اسے اس طرح نہیں دیکھا کہ یہ مسئلہ جنتا کی جہالت دور کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ کچھ اور ادب کو عام جنتا تک پہنچانے کا مسئلہ بھی ہے اور یہ دانشوروں کے ایک حصہ سے احیاء پسندی اور لٹریچر کے زمانے کو لوٹانے کا جذبہ اور دوسرے رجعت پرست رجحان جنہیں سامراج کے ساتھیوں نے پھیلایا تھا دور کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔

ہندوستان کی سیاست میں ہندو مذہم سوال کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی گئی؟ جنتا کی جمہوری تحریک کو آگے بڑھا کر نہیں بلکہ کسی نہ کسی شکل میں فرقہ واری تناسیب قائم کر کے۔ یہی صورت زبان کے مسئلہ میں اختیار کی گئی۔ ایسی زبان جو اعلیٰ تہذیبی ضروریات پوری کر سکے۔ لیکن اس کے لئے انہوں نے بول چال کی زبان کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ فارسی یا سنسکرت کی ڈکشنریوں سے نکلے اور یہاں بھی فرقہ واری تناسیب کسی نہ کسی طریقہ پر ٹھونسنے کی کوشش کی۔

ڈکشنری کی مدد سے ہندوستانی بنائی گئی۔ لیکن یہ وہ مقصد پورا نہ کر سکی، جس کے لئے وہ بنائی گئی تھی۔ دوسرے رسم الخط میں ایک ہندوستانی رائج کر کے مسئلہ آج بھی حل نہ ہو سکا۔ اگر دونوں رسم الخط میں جو حفظ استعمال کئے جاتے ہیں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور دونوں کو ہندوستانی کا نام دیا جاتا ہے تو اس سے الجھن اور بڑھتی ہے۔ ساتھ ہی ایک دوسرے کو گالیاں دیتے کا سلسلہ بندھ جاتا ہے۔ اگر دوسرے رسم الخط میں ایک ہندوستانی کے معنی ہم یہ نہیں لیتے کہ اردو اور ہندی دوسرے رسم الخط میں، بلکہ ایک عام مقبول زبان دوسرے رسم الخط میں تو بھی اس حل سے اصل مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ہم یہاں اعلیٰ تہذیبی ضرورتوں کے لئے بول چال کی مشترکہ زبان استعمال کرتے وقت ہندی اور اردو کے حقیقی فرق کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ یہ فرق زمانے کے ساتھ مٹتا جائے گا۔ کتنے عرصہ میں؟ اس کا انحصار اس پر ہے کہ ہم اسے نظر انداز کرنے کے بجائے کتنی جلدی اس کا جائزہ لیتے ہیں اور ایسے طریقہ کار اختیار کرتے ہیں کہ یہ فرق جلد سے جلد مٹ جائے۔ ایک ایسی ہندوستانی جو اردو اور ہندی دونوں سے آزاد ہو ایک دن میں نہیں بن سکتی۔ اس لئے فوری حل

یہ بھول نہیں کیا جاسکتا کہ ایک رسم اخلاقیہ یا دھرم ہندوستانی رائج کی جائے۔

اس لئے ہندوستانی علاقوں کی زبان کے مسئلہ کا حل صرف ایک رہ جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ ہندی اور اردو دونوں کو موجودہ شکل میں ساتھ ساتھ رہنے دیا جائے اور اس کا موقع دیا جائے کہ دونوں جلد سے جلد ایک دوسرے میں قدرتی طور پر مل جائیں ہندی اور اردو کا مسئلہ اس طرح حل نہیں ہو سکتا کہ ایک کے لئے دوسرے کو بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ اس کا ممکنہ حل ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ دونوں قدرتی طریقہ پر ایک دوسرے میں مل جائیں اور یہ عمل جتنا کی بول چال کی زبان ہی کی بنیاد پر ہو سکتا ہے۔ اس کے لئے زبان کے اوپر کے ڈھانچے میں بھی اسی بول چال کی زبان کے قاعدوں پر پابندی کرنی ہوگی۔ اپنی زبان اور ادب کو جنت کی جدوجہد سے جوڑنا ہوگا۔ ان کے بغیر زبان اور ادب کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔

دیش کی بورڈز اور جاگیر داری حکومتیں اتحاد کے نام پر ایک زبان کو دوسری زبان پر قربان کر دینا چاہتا ہیں اس پالیسی سے اتحاد کی بجائے فرقہ داری نفرت بڑھتی ہے۔ اور مزدور طبقہ میں زبان کے مسئلہ پر پھوٹ پڑتی ہے اور آج بورڈز و ایڈیٹری چاہتے ہیں۔ مولانا نکر نہایت بشری کے ساتھ اور صاف صاف یہ کہتے ہیں کہ زبان کا مسئلہ اس طرح حل کیا جاسکتا ہے کہ اقلیتوں کی زبان اور کلچر کو تباہ کر دیا جائے۔ ہندوستان ٹائمز میں جس کا ذکر اوپر آچکا ہے انھوں نے لکھا ہے:-

”ہم سخت تذبذب میں ہیں۔ اگر اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ آخر میں کسی گروپ کے کلچر اور زبان کو تباہ کرنا ہی پڑے تو عقل کا تقاضا یہ ہے کہ وہ گروپ اکثریت کا نہیں بلکہ اقلیت کا ہونا چاہیے۔ بورڈز و ایڈری واقعی بڑی مشکل میں ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کون سی زبان

رہنی چاہئے، اقلیت کی یا اکثریت کی؟ سوال یہ ہے کہ اس طبقہ کو کس طرح بچانا چاہئے جس کی وہ نمائندگی کرتے ہیں۔ وہ ایسے طبقے کی خدمت کرنا چاہتے ہیں جو ہندوستانی جنتا کا دشمن ہے اور اس لئے وہ زبان کے مسئلہ پر اقلیت اور اکثریت کا سوال اٹھاتے ہیں۔ اس قسم کا حل مزدور طبقہ کبھی نہیں مان سکتا اور نہ ہی کوئی ایسا شخص مان سکتا ہے جس میں جمہوریت کا ذرا سا بھی شعور ہو۔ اس حل کے معنی یہ ہیں کہ زبان کے مسئلہ پر حکمران طبقہ کے مفاد میں جنتا میں پھوٹ پڑے اور خون خرابہ ہو۔ یہ حکمران طبقہ سوشلزم اور جمہوریت کی جنتا کی لڑائی کی وجہ سے سخت مشکل میں ہے۔

پھر رخوا طبقہ اور جاگیرداروں کے سامنے بحیثیت طبقوں کے کوئی مستقبل نہیں ہے وہ نیم غلامی کے نظام کے مرتے ہوئے طبقے ہیں جو اس سامراج کے ساتھ مر رہے ہیں جس نے انہیں پیدا کیا تھا۔ یہ مرتے ہوئے طبقے اتحاد، مشترکہ کلچر اور جنتا کی مشترکہ زبان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اسی لئے وہ جنتا کے سامنے یہ حل پیش کر رہے ہیں۔ جو اگر مان لیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ جمہوری جدوجہد کا گلا اپنے ہاتھ سے گھونٹ رہے ہیں۔

ہندوستان کے محنت کش عوام منظم مزدور طبقے کی رہنمائی میں ایشیا کی ابھرتی ہوئی جنتا کا حصہ ہیں۔ یہ وہ طبقے ہیں جو کل کے روشن اور شاندار ہندوستان کے عمار بنیں گے۔ صرف یہی طبقے ہیں جن کی نظر اس قدر تیز ہے کہ وہ آج کے جھگڑوں کے دھندلے میں اس اتحاد کو دیکھ سکتے ہیں جو جنتا کی مشترکہ جدوجہد میں آج بھی پیدا ہو رہا ہے۔ ہندوستان کی جنتا مشکل میں نہیں ہے اس کا مستقبل اس کی آنکھوں کے سامنے صاف اور روشن ہے۔ اس مستقبل میں مذہب اور فرقہ کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں ہو سکتی۔ اس مستقبل میں

زور زبردستی کا اتحاد نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد اس پر ہوتی ہے کہ ایک طبقہ دوسرے پر جیتے۔ یہ مستقبل بالکل قریب ہے۔ یہ آج عوام کی جدوجہد کے دوران میں تعمیر ہو رہا ہے۔

اس لئے مزدور طبقہ اور تمام محنت کش عوام کو یہ مطالبہ کرنا چاہیے کہ ہندوستانی کے علاقہ میں ہندی اور اردو دونوں کی یکساں طور پر حفاظت کی جائے۔ یہ کام ایک مرحلے پر ہوئے طبقے کے سپرد نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اس کا تصفیہ کرے کہ ایک مشترکہ زبان کس طرح ترقی کرے گی۔ عام جنتا اپنی بول چال کی زبان میں ہائیکتا پیدا کرتی ہے اور وہی اپنے علاقہ میں ایک مشترکہ تہذیبی زبان کو بھی ترقی دے گی۔ اسے مطالبہ کرنا چاہیے کہ دونوں زبانوں کی یکساں طور پر حفاظت کی جائے تاکہ وہ اپنے طبقہ واری اتحاد کو کلچر کے میدان میں بھی منواسکے، اور اپنی بول چال کی زبان کو قدرتی اور جمہوری طریقہ پر ترقی دے کر ہندی اور اردو کو ملا کر ایک زبان کر دے۔ اس حل سے زبان کے مسئلے جھگڑے کم ہو جائیں گے، اتحاد کی طاقتیں کافی مضبوط ہو جائیں گی اور بورژوا طبقہ جنتا کو جمہوری انقلاب کی جدوجہد کے راستہ سے ہٹانے کے لئے زبان کے مسئلہ کو کبھی استعمال نہیں کر سکے گا۔

ماضی کے ادبِ عالیہ سے متعلق

”علم تمھارے لئے بہ منزلہ کھوئی ہوئی بھیلوں کے ہیں، جہاں
سے بھی ملیں انھیں لاؤ۔“ (حضرت علی کرم اللہ وجہہ)

ایک ایسے زمانہ میں جب کہ طبقاتی جنگ بہت تیز ہو جاتی ہے تو جذباتی دھومیاں نظر آتی
کمزوری کے باعث ادبی پیکھ میں غلطیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ تصور سیاسی تیز پسندی کا نہیں ہے
کیونکہ سیاست تو تیز ہوتی ہی ہے۔ بورژوا نظام کے تضاد جوں جوں ابھرتے جاتے گئے
طبقاتی جنگ کا تیز ہونا لازمی ہے۔ نتائج کا تقاضا تو انھیں تضاد کو زیادہ سے زیادہ ابھارتے
اور تیز کرنے ہی کا ہے۔ لیکن جب سماجی ارتقاء کے قوانین کا اطلاق بہت بھونٹے اور
میکانیکی طور پر ادب پر کیا جانے لگتا ہے تو نہ صرف ادب ہی کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ انقلابی
قوتیں بھی کمزور ہوتی ہیں۔ مارکسی تنقید میں اقتصادی بنیاد کی اولیت اور طبقاتی جنگ،
ادبی جائے پڑتال کا بہترین آلہ ہے۔ لیکن جب اس آلہ کو باقاعدہ تمام حالات اور علوم
کا جائزہ لئے ہوئے میکانیکی طور سے استعمال کیا جاتا ہے تو یہی آلہ علم دشمنی اور جہالت کا

حرب بھی بن جاتا ہے۔ اشتراکی انقلاب کے پہلے اور بعد میں نہ صرف روس ہی میں بلکہ انگلینڈ اور مارکس کے زمانہ میں بھی خود جرمنی میں ایسے ناقدین موجود تھے جو مارکسزم کو ایک میکانچی علم بنا کر ماضی کے ادب کو جانچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ایسے مواقع پر مارکس اور اینگلس دونوں بھی اپنا قلم اٹھایا ہے۔ اسی طرح لینن نے ہرزہ گو معلموں کے خلاف نہ صرف بہت کچھ لکھا ہے بلکہ علمی تنقید کے ذریعے ہماری رہنمائی بھی کی ہے۔ ہم کوشش کریں گے کہ اپنے ماضی کے ادب کی کسوٹی بناتے وقت ان کی تعلیمات کو سامنے رکھیں۔ قبل اس کے کہ ایک اتنے بڑے مسئلے کو ہاتھ لگایا جائے میں تمہیں صرف سماجی ترقی کے مفہوم اور کلاسیک ادب کے چند بنیادی مسائل کو پیش کر دوں گا۔

جسے ہم سماجی ترقی کہتے ہیں اس کا تعلق ترقی کے مختلف سمتوں سے ہے معاشی اور سیاسی ترقی کے ساتھ اگر مادی اور ارضی نقطہ نگاہ اور بنی نوع انسان کی وحدت کا تصور نہ ابھر سکے تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ابھی ہماری ترقی نہ صرف نامکمل ہی ہے بلکہ اس پر کھوٹ بھی ہے۔ کیونکہ سماجی شعور ایک خلا قانہ قوت ہے جو معاشی بنیادوں پر اثر انداز بھی ہوتی ہے۔ اگر سماجی شعور کی بنیادیں مستحکم نہیں ہیں تو ممکن ہے کہ وہ ہمیں غلط معاشی نظام کی طرف لے جائیں یا لوٹا دیں۔ یہی خطرہ ہمیں تصنیفات کے فوری اثر ہی کو دیکھنے تک محدود نہیں رکھتا ہے بلکہ اس کے دیر پا اثرات کا مطالعہ بھی لازم کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کسی زمانے کی ادبی تصنیف فوری اثر کے اعتبار سے کمزور ہو لیکن سماجی ترقی میں دیر پا اثرات کی حامل ہو۔ اس حقیقت کا ایک مخالف پہلو بھی ہے۔

یہ بات تو مسلمہ ہی ہے کہ ادب اور تہذیب کی ترقی طبقاتی سماج میں ہوئی۔ چنانچہ طبقاتی اثرات کی چھاپ تو ادب اور کچر دونوں ہی پر ہے۔ لیکن جب ہم اس طرح سوچیں

تو ہمیں سماجی ترقی کے مفہوم کو بھی اپنے ذہن میں رکھنا چاہیے۔ غلامی کا دور استحصالی نظام کو وجود میں لانے کے خیال سے ایک ہزار ماہ تصور کیا جاتا ہے لیکن قبائلی نظام کے مقابلے میں اس دور میں انسان نے زیادہ ترقی کی ہے۔ اس لئے اس دور کا کچھ حصہ ترقی پسندی کا بھی دور رہا ہے۔ یونان کا تمام علم و ادب اسی دور میں بار آور ہوا اس دور کے علم و ادب نے ترقی اور رجعت دونوں ہی کی نمائندگی کی ہے۔ کسی بھی دور کی سب چیزیں ترقی پسند نہیں ہوتی ہیں اور نہ انھیں تاریخی تقاضوں کا نتیجہ ہی کہہ کر ٹالا جاسکتا ہے۔ ترقی اور رجعت کی روایات پیہم ایک دوسرے کے ساتھ دست گیر رہی ہیں۔ سماجی ارتقاء ترقی کی قدیم روایات آگے بڑھا کر ایک نئی صورت میں تبدیل کرتا رہا ہے۔ وہ ناقص اور غیر سائنسی روایات کو فسخ بھی کرتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک قائم ہے۔ اگر بنیادی اعتبار سے دیکھا جائے تو یہ ترقی دو لفظوں میں سمٹ آتی ہے، طریق پیداوار کو بڑھانے اور اس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دینے اور انسانیت کو آزاد کرانے کی جدوجہد میں جن قوتوں نے حصہ لیا ہے انھیں ہم ترقی پسند کہتے ہیں۔ یہ قوتیں مختلف ممالک میں ایک ہی وقت میں اپنے ملکی حالات، ماحول مختلف صورتوں میں کام کرتی رہی ہیں۔ ہم ایک ملک کی مثال کو دوسرے ملک میکسیکو پر لاگو نہیں کر سکتے ہیں۔ پھر یہ کہ علم و ادب کا رشتہ معاشی بنیادوں کے ساتھ طبقاتی نظام میں اتنا براہ راست نہیں رہا ہے جتنا کہ قبائلی نظام میں تھا۔ طبقاتی نظام میں تو ان چیزوں نے اکثر و بیشتر ایک بار معاشی بنیاد سے متعین ہو کر اپنی ایک آزاد زندگی بھی اختیار کر لی ہے۔ اکثر ان کی یہ آزادی اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ وہ اپنی ترقی کے مخصوص قانون اور منطق بھی بنا لیتے ہیں۔ ہمیں فکری تحریکیں کو جانچتے وقت نہ صرف

طبقاتی جنگ ہی کو دیکھنا ہے بلکہ ان کے تسلسل، منسلق اور قانون کا پتہ بھی چھٹانا ہے چونکہ فکری تحریکیں ادب پر گہرے اثرات چھوڑتی ہیں اس لئے ان کا مطالعہ معہ ان کی منسلق کے بہت ضروری ہے۔ فکری تحریکیں اس لئے بھی اہم ہیں کہ وہ ایک مخصوص عہد کے ارضی نقطہ نگاہ، موعود اور اک حقیقت کا پتہ بھی دیتی ہیں۔ ان کی مدد سے ادب سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔ ادب کی تعریف لینن نے نہ صرف اس طرح کی ہے کہ ادب خارجی حقیقت کا آئینہ ہے بلکہ اس طرح بھی کہ ادب اور اک حقیقت میں مدد بھی کرتا ہے انھیں معنوں میں ادب ہماری جسمانی، ذہنی، جذباتی زندگی کا ایک ایسا مرکز ہے جس کی مدد سے کسی بھی زمانے کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ یہ تاریخ پورے سماج کی زندگی کی تاریخ ہوتی ہے جو حقیقت میں نئے اور پرانے کی جنگ کی تاریخ ہوتی ہے۔ ترقی پسند ادیب کسی نیکسی معنی میں نئے کے ساتھ ہوتا ہے اس وقت یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ وہ مکمل طور پر نئے کے ساتھ ہو۔ کیونکہ جس حد تک نئے دور کی متضاد تدریجوں کی گنجشک تصویر عوام کے ذہنوں میں جھلکتی ہے۔ ادیب کا ذہن بھی گنجشک ہوتا ہے اس لئے وہ اکثر متضاد باتیں بھی کرتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ بنیادی اعتبار سے پرانے کے خلاف جنگ کر کے کون سی نئی چیزیں لانا چاہتا ہے۔ اگر وہ صرف ماضی کی چیزیں واپس لانے کی کوشش کر رہا ہے تو ہم اسے رجعت پرست سمجھیں گے۔ خواہ وہ ایک مخصوص عہد کے پرانے چیز کے خلاف ہی جنگ کیوں نہ کر رہا ہو۔ میں نے اس چیز کا تذکرہ اس لئے کیا ہے کہ جب انحطاطی حکمران طبقہ اپنے کو زندہ رکھنے کی کوشش کرتا ہے تو بہت سے نئے تصورات کو بھی اپناتا ہے۔ لیکن وہ ان تصورات کو صرف اپنے طبقاتی مفاد کے لئے استعمال کرتا ہے اس کی یہ کوشش اصل میں قدیم کو زندہ رکھنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس کی واضح مثال

اسلامی تاریخ میں امام غزالیؒ کا زمانہ ہے۔ اس وقت اسلام کی شرعی حکومت انحطاط کی مکمل صورت میں تھی۔ شرع اور فقہ پر چاروں طرف سے حملے ہو رہے تھے۔ دشمنان شرع یونانی علوم سے یس تھے۔ بالآخر امام غزالیؒ کو بھی یونانی علم کلام کو مستحالیٰ بنا پڑا لیکن امام غزالیؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اُسے جن مقاصد کے لئے استعمال کیا وہ قطعی حجت پسند تھے اسے مادی ترقی کے بجائے روحانی استدراک کا ذریعہ بنایا۔ اسلام میں مابعد الطبیعیاتی منطق کی راہیں انھیں کی کوششوں سے کھلی ہیں۔ میرجودہ دور میں اس کی مثال علامہ اقبالؒ کی فکری کوششیں ہیں۔ علامہ اقبالؒ رحمۃ اللہ علیہ نے اسلام کی روحانی جمہوریت کو واپس لانے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں انھوں نے ان ذرائع کو بھی استعمال کرنا چاہا ہے جن سے یورپ میں ترقی ہوئی تھی۔ لیکن ایسے تمام ذرائع کو وہ اپنے مخصوص مقصد کا پابند بھی بنا دیتے ہیں اور یہی چیز ان کے کلام میں تضاد بھی پیدا کر دیتی ہے۔ کیونکہ مادی ذرائع روحانی مقاصد کے ساتھ ہمنا نہیں ہو سکتے ہیں۔ اگر انسان عناصر فطرت پر تصرف حاصل کرے گا تو اس کا مقصد صرف مادی ہو گا۔ یہی وہ سبب ہے کہ اقبالؒ کے کلام کے ترقی پسند اجزاء خود اپنی مخالفت کرنے لگتے ہیں۔ یوں تو علامہ اقبالؒ کا فلسفہ خودی بڑا جاندار معلوم ہوتا ہے لیکن جب وہ شریعت یعنی نیابت الہی کا پابند ہو جاتا ہے تو اس کی بغاوت کی حد و دہی متعین ہو جاتی ہیں۔ میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو شریعت کو ایک سیال تصور بنا کر ہر نئے نظام پر منطبق کر دیتے ہیں۔ شریعت کی نظریاتی بنیاد یا بالکل متعین ہیں اور اس کے عمل کی تاریخ ایک لمبے چوڑے دور پر پھیلی ہوئی ہے اگر ہم اسلامی تاریخ کے ایک بہت ہی مختصر سے وقت کو چھوڑ دیں تو یہ ماننا پڑے گا

کہ شریعت کو استحصالی طبقے نے استعمال کیا ہے اور جب تفسیریں لکھنے کا وقت آیا تو تمام تر فقیہوں نے ایسے ہی نکات پیش کئے جن سے حکمران طبقے کی پوزیشن مضبوط ہوئی۔ بالآخر خلافت (دینی ریاست) ایک ایسا ادارہ بن گیا جس کی مخالفت کو ایک مقدس فریضہ بنا لیا گیا۔

شریعت کی مخالفت اسلامی تاریخ کا ایک زبردست کارنامہ ہے۔ اس بغاوت کی ابتدا ان وحدۃ الوجودی صوفیوں نے کی جو یونان کے فلسفہ وحدت الوجود متاثر تھے۔ یہ فلسفہ فلاطون کا نہیں تھا بلکہ پلوٹینس کا تھا جس نے فلاطون کی عینیت اور دیو قریطس کی مادیت کو ہم آمیز کرنے کی کوشش کی تھی۔ بغاوت کی اس آواز کو ذوالنون مصری، ابازید نظامی اور حلاج نے اٹھایا۔ اس کے لئے یہ آواز اٹھانی ہی مشکل تھی، اگر یونانی وحدت الوجود کے فلسفے کو توحید مطلق کے فلسفہ پر برتری حاصل نہ ہوتی۔ توحید مطلق کے فلسفے میں مادہ مخلوق ہے اور ایک مخصوص زمان و مکان کا پابند ہے۔ اس کی ایک ابتدا اور انتہا ہے۔ وہ اپنی صورت پذیری میں قادر مطلق نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا محرک اور خالق ایک دوسری قوت ہے۔ جس طرح اس قوت نے قوانین فطرت وضع کئے ہیں اسی طرح سماجک (Economic) سوسائٹی کے لئے بھی چند قوانین وضع کر دئے ہیں۔

وحدت الوجود کے فلسفہ میں مادہ روح کے ساتھ ہم وجود ہے۔ مادہ بھی روح کے ساتھ لازمی اور ابدی ہے۔ مادے کا خالق کوئی نہیں ہے بلکہ مادہ اور روح ایک دوسرے کے لئے جزو لاینفک ہیں، اس طرح انسان کا عمل اور ارادہ مشیت (یزوی) میں شامل ہو جاتا ہے۔ اگر انسان کسی چیز کی تخلیق یا تخریب کرتا ہے تو اس میں مشیت کو بھی دخل ہے کیونکہ مشیت کا اظہار مادہ کے توسط سے ہی انسانی عمل ہی کے ذریعہ ہو سکتا ہے۔

وحدت الوجودی صوفیوں نے اسی منطق کی بنیاد پر اسلامی اخلاقیات کو سبوتاژ سے آزاد کر کے عمل میں منتقل کر دیا اور ان تمام مذہبی دیواروں کو گرائے کی کوشش کی جو انسانوں کے درمیان کھڑی کر دی گئی تھیں۔ ان اسباب کے ماتحت یہ کچھ تعجب کی بات نہیں ہے کہ صوفی عوام میں بہت مقبول ہوئے۔ وہ درباری زندگی سے گریز کرتے تھے اور انھوں نے اسلامی تاریخ میں دینی ریاست کے قائم ہونے کی مخالفت کی ہے۔ یہ تذکرہ اس لئے کیا گیا کہ صوفیوں نے بظاہر کھل کر کسی عوامی شورش میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن عوامی تحریک کے ساتھ ان کی ہمدردی بالواسطہ شامل رہی ہے۔

جس حد تک یونانی وحدت الوجود کا فلسفہ اور ایرانی گہر و ترسا کے مادی فلسفے کی روایات توحید مطلق کے فلسفے کے ساتھ ہم آمیز ہو کر ہوئی گئیں۔ صوفیوں کے انقلابی پن میں بھی کمزوری آتی گئی۔ اس فلسفے نے پہلی بیعت امام غزالیؒ کے ہاتھوں کی اور دوسری بیعت مجدد الف ثانی سرسندیؒ کے ہاتھ۔ امام غزالیؒ نے وحدت الوجود کو اس کے مادی جزو سے بالکل ہی آزاد کر دیا۔ محسوسات کے فلسفے کو خالص وجدانی اور باطنی فلسفہ بنا کر تصوف کو روحانی مشق و مہارت کی چیز بنا دی۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے شریعت اور طریقت کو ہم آمیز کرنے کی کوشش کی۔ اسی طرح جب مجدد الف ثانی سرسندیؒ نے ہمہ ادست کو ہمہ ازادست میں تبدیل کیا تو مادے کو بالکل مخلوق ہی کی صورت دیدی اس کے یہ معنی نہیں کہ وحدت الوجود کا بذات خود یعنی فلسفہ جو مادے اور روح کو ہم آمیز کرتا ہے بہت سے معنی میں ہلک ثابت نہیں ہوا۔ ہر چند وحدت الوجود دیوں نے مادے اور روح کی دوئی کو ہم آمیز کرنے کی ناکام کوشش کی، وہ عینیت سے چٹکارا حاصل نہ کر سکے انھیں روح کو فاعل اور مادے کو مفعول بنا ہی پڑا یہی وہ سبب ہے کہ اس فلسفے میں فکر کو

عمل پر ترجیح دی گئی ہے۔ صوفیوں کی زندگی میں تفکر پسندی، خاموشی اور اعتکاف انہیں تصورات کے ماتحت آیا ہے۔ لیکن اس فلسفے کا ایک حسین پہلو بھی تھا۔ صوفیان کرام انسان کو عالم اکبر تسلیم کرتے تھے اور نوا میں فطرت میں صرف انسان ہی کی جلوہ گری پر اپنا ایمان کتے تھے تیسرے کا ایسا تھکا ہارا انسان بھی اس رمز سے واقف تھا۔

ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں اپنے سوائے کس کو معبود جانتے ہیں اپنی ہی سیر کرنے ہم جلوہ گر ہوئے تھے اس رمز کو لیکن معدود جانتے ہیں یہاں تو خدا کو بندے سے یہ پوچھنے کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی کہ بتائیری رضا کیلئے ہے چہرہ اختیار کا جھگڑا تو صرف اسی وقت باقی رہتا ہے جبکہ ہم مادے کو مخلوق تصور کریں۔ یہ کشمکش تو صرف توحید مطلق ہی کی دی ہوئی ہے۔ بھلا سترھویں صدی کا انخطاطی تصوف اس کی زد سے کیوں کر بچ سکتا تھا بالآخر میر کو بھی اپنی خود مختاری کا اعتبار جاتا رہا۔

اسی طرح حلاج کا فلسفہ بقا باللہ بھی انخطاطی دور میں بالکل ہی ختم ہو گیا تھا صرف فنا فی اللہ کا لفظ یاد رہ گیا تھا۔ حلاج کے بقا باللہ کے اصول کے مطابق انسان ذاتِ باری کی غلافانہ صفات میں غم ہو کر تغیر واد۔ تخلیق پر آمادہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبال نے اسی تصور کے ماتحت انسان کو خالق بھی بتایا ہے۔ فنا فی اللہ کا وہ درجہ ہے جب کہ وہ اپنی تغیر کو نئی تخلیق کے لئے فنا کر دیتا ہے۔ چونکہ بقا باللہ میں انسان کے بندہ رہنے کا تصور کمزور ہو جاتا ہے۔ اس لئے توحید مطلق کے ماننے والوں نے اس کی بڑی مخالفت کی۔ اسے کفر کے قریب گردانا گیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان صوفیوں نے زیادہ تر فنا فی اللہ ہی کو رواج دیا۔ پھر یہ کہ جاگیر دارانہ نظام کا انخطاط اس خیال کو ہوا دینے میں اور بھی دھکار ثابت ہوا۔ زندگی میں کوئی بھی نئی تخلیق بغیر مادی علوم کے ناممکن ہے، یہاں اہل شرع

اور اہل صفادوں نے ہی نے مادی علوم کو اور ایک حقیقت سے خارج کر دیا۔ اہل صفا تو محسوسات سے لپٹے بھی رہے لیکن اہل شرع نے تو اس کی بھی مخالفت کی۔ ان تمام چیزوں کا زیادہ اہم بات تو یہ ہے کہ وحدت الوجودی بنیادی طور پر اگر ایک طرف منطاب فطرت کی وحدت کے قائل تھے تو دوسری طرف کائناتی تخلیق کے منطاب ہر کی عالمی حیثیت کو مانستے تھے۔ سماج کے بارے میں ان کا یہ تصور نہ تھا کہ فرد نے کسی معاہدے کی بنا پر اپنے اختیارات سماج کو لے کر لئے ہیں۔ بلکہ یہ کہ انسانوں کا سماج اسی طرح ایک عالم ہے جیسے نباتات یا جاندار کی دنیا ہے۔ ان کا سماجی تصور *عنف* بلکہ عالمیاتی ہے۔ اسی وجہ سے بنی نوع انسان کی وحدت کا تصور اس کی شاعری میں بہت قوی ہے۔ غالب کا شعر ہے۔

بروز سے مردم شود انجمن شود تازہ پیوند جانہا بہ تن

اسی تصور کے ماتحت ان میں انسان دوستی کا جذبہ بھی بہت شدید تھا۔ لیکن چونکہ وہ مادے کے ارتقا، اور اس کے جدلیاتی عمل سے واقف نہ تھے اس لئے سماجی ارتقا کو طبقاتی کشمکش میں نہ دیکھ سکے۔ یہ راز تو یورپ میں صنعتی انقلاب کے بعد ہی آشکارا ہوا۔ پھر ہم اس کی توقع صوفیوں سے کیوں کر کر سکتے ہیں۔

بڑی ضمنی سی بات ہے، لیکن کہہ دینے میں ہرج ہی کیل ہے۔ یورپ کو پہلی دفعہ گوٹے نے آفاقی ادب کا تصور دیا ہے اور اسے اتفاقی ہی سمجھے کہ گوٹے وحدت الوجودی بھی تھا۔ اس گوٹے کے بارے میں انیکلز نے لکھا ہے۔ "گوٹے خدا کے تصور کے ساتھ کھیلنا نہیں چاہتا تھا اسے تو یہ نقطہ ہی کہ مساویاتھا وہ تو صرف انسانوں ہی کے ساتھ مانوس تھا اس کی یہ انسان دوستی، ادب کو مذہب سے آزاد کر دینے کی کوشش۔ گوٹے کا یہ سب سے بڑا کارنامہ تھا۔ اس اعتبار سے نہ تو ماضی کے بڑے بڑے مصنفین اور نہ شکسپیر ہی اس کا

ہم پلے ہے۔“ لیکن میں اسے اتفاق نہیں سمجھتا ہوں۔ کیونکہ فارسی اور اردو ادب میں تو صوفی وحدت الوجودی صوفیوں ہی نے خدا کے تصور کو چیلنج کیا ہے۔ میں فیضی اور غالب کے اشعار پیش کرنا نہیں چاہتا ہوں بلکہ میں مولانا روم کا ایک شعر پیش کر رہا ہوں جس کی مدد سے آپ کو وحدت الوجود کا فلسفہ بھی سمجھ میں آجائے گا۔

می گفت در بیاباں ز ند و دل و ریدہ صوفی خدانہ دارد ادنیست آفریدہ

بیاباں مولانا نے صاف لفظوں میں وضاحت کر دی ہے کہ چونکہ ماوے کا کوئی خالق نہیں ہے اس لئے انسان کا بھی کوئی خالق نہیں ہے۔ یہی منطق حلاج کو انا الحق کی طرف لگائی تھی۔ اور اس منطق کے ماتحت کتنے صوفی شعرا حاکم بدین کہہ کر ناموش ہو گئے۔ مجھے یہ کہنے میں جھجک نہیں ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں جاگیر دارانہ نظام کے زمانے تک انسانی عظمت کی گیت اسی فلسفے کے ماتحت آئے ہیں۔ وہ تمام صوفی شعرا جنہوں نے شریعت کے ہاتھ بیعت کر لیا ہے وہ بھی انسان کی عظمت کے ایک حد تک قائل ہیں۔ لیکن اس سے آگے قدم اٹھانا نہیں چاہتے۔ انہوں نے زیادہ سے زیادہ ایک درمیانی راستہ اصلاح کا اختیار کیا ہے۔ جس حد تک علامہ اقبال حلاج کے فلسفے سے متاثر ہیں، انسان کو حرم کیمیا میں لا کر کھڑا بھی کیا ہے لیکن جس حد تک وہ امام غزالی اور سرہندی کے تصوف سے متاثر ہیں۔ مادی نقطہ نگاہ سے انسانی عظمت کی نفی بھی کی ہے۔ توحید مطلق اور وحدت الوجود متضاد سروں کے ملانے ہی کی کوشش میں علامہ اقبال نے خدائے تعالیٰ کو لامحدود اور محدود دونوں ہی بتایا ہے اور یہی کوشش اجتہاد اور تقلید کے تضاد کو بھی قائم کرتی ہے ان کا یہ کہنا ہے کہ اجتہاد ترقی کے زمانے میں کرنا چاہا ہے اور تقلید انحطاط کے زمانے میں۔ جب بھی کوئی رہنما انسانوں کو مقام کبریا بتا کر اسے مخلوق کا لقب بھی دے دیتا ہے

تو وہ اسے بندہ محکوم بنانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس پر مزید روشنی ڈالنے کے لئے میں لیڈن کی تحریر کا اقتباس پیش کر رہا ہوں۔ حقیقت میں یہ خدا کا تصور نہ تھا جس نے بہیمانہ انفرادیت پرستی کو دیا یا ہے۔ یہ کام ابتداء کی جماعتی زندگی نے کیا ہے۔ خدا کے تصور نے تو ہمیشہ سماجی جذبہ کو کمزور کیا ہے۔ خدا کے تصور نے کبھی بھی فرد اور سماج کے رشتے کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔ بلکہ مظلوم طبقہ کو غلامی کی زنجیروں میں اس عقیدت کے ماتحت جکڑے رکھا کہ حکمراں طبقہ پر خدا کا سایہ رہتا ہے۔“

اس میں شک نہیں کہ لینن نے جو کچھ لکھا ہے مغرب کی تاریخ کو سامنے رکھ کر لکھا ہے۔ لیکن یہ غلط بھی نہیں ہے کہ خلل سماجی کا تصور تو ہمارے یہاں بھی کارفرما رہا ہے اور یہ تصور صرف توحید مطلق ہی کا جزو بن سکتا ہے۔ وحدت الوجود میں تو اس کی گنجائش ہی نہ تھی۔ لیکن توحید مطلق کے فلسفے سے متاثر ہونے کے بعد توصیفیوں کے یہاں بھی دلیلوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا تھا جو یا تو سیاست سے کنارہ کش ہو گئے تھے یا پھر ظل اللہ کی مراعات کے محتاج تھے۔ جہاں تک مادی فلسفے کے نقطہ نگاہ سے دیکھنے کا تعلق ہے توحید مطلق اور وحدت الوجود دونوں ہی عینی فلسفے ہیں۔ لیکن جاگیردارانہ نظام کی گذشتہ تاریخ میں توحید وجودی نے سیاسی مطلق العنانی، عقائدی کٹر پن اور الہیاتی منطق کے خلاف جو جنگ کی اسے ہم نظر انداز بھی نہیں کر سکتے، اس نے اس جنگ میں اور اک حقیقت کے لئے محسوسات کی شرط ٹھہرائی۔ چشم و گوش اور کام و دہن کی لذت کو ابتدائی زینہ سمجھا اور شعر و ادب میں محسوسات کی تمام رعنائیوں کو رچایا، اس نے مصوری، بت تراشی، موسیقی، رقص، شعر و نغمہ کسی بھی چیز کو ممنوع قرار نہ دیا یہ بات دوسری ہے کہ اس نے ہر چیز کو ایک پرودہ بنایا۔ لیکن حقیقت تو یہی ہے کہ ہر پردہ

کو کیسی اٹھانہ سکا۔ کیونکہ انسانی دماغ مادے سے ماوراء تصورات کو ذہن میں لا ہی نہیں سکتا ہے۔ اگر مشرق میں کچھ لوگ حافظہ کے دیوان کا مطالعہ حقیقت کے رنگ میں کرتے ہیں تو اس میں کس کا قصور ہے۔ اگر گوئٹے اور ہلٹے نے حافظہ کو صرف محاذ ہی کے رنگ میں دیکھا تو علامہ اقبال کو تو خوش ہی ہونا چاہیے تھا کہ دنیا کے ایک حصہ پر فلاطی گو سفند کی روحانیت کا رنگ نہیں ہے۔ لیکن وہ اس بات سے بھی مکدر تھے۔ وہ تو یہی چاہتے تھے کہ حافظہ کا مطالعہ صرف مذہبی رنگ میں کیا جائے تاکہ کریمین مغرب اور ایشیائی مسلمان اس کی ایرانی نیگزیم کی مخالفت کرے۔ رہ گئی بے ثباتی و دنیا کی بات تو اس کی مخالفت تو کوئی بھی ایسا شخص نہیں کر سکتا ہے جو مادے کو مخلوق سمجھتا ہے کیونکہ اگر مادہ مخلوق ہے تو اس کی ایک ابتدا ہے اور ایک انتہا بھی۔ کم از کم اہل شرع کو تو بے ثباتی و دنیا کا گلہ کرنا ہی نہیں چاہیے مسلمان صوفیوں میں تو یہ چیز توحید مطلق ہی کے فلسفے کے ماتحت آئی۔ ورنہ وحدت الوجودی کی آواز تو ہمیشہ یہی رہی ہے۔ ”ہم سے پہلے نہ تو ابد ہے اور نہ ہمارے بعد ازل“۔ طلاق

پھر یہ چیز صوفیوں تک کے ساتھ کیوں منسوب کر دی گئی۔ قصہ یہ ہے کہ براکلیش کے قول کے مطابق وحدت الوجودی بھی اس بات کو ملتے تھے کہ ہر چیز ہے اور نہیں ہے، یعنی ہر چیز ایک صورت سے دوسری صورت میں تبدیل ہوتی رہتی ہے۔

ہر قطعہ چمن پر ٹک غور سے نظر کر، بگڑ گئیں ہزار شکلیں تب پھول یہ بگاڑیں
مت سہل ہمیں جانو پھر تلہ فلک سوں تب فلک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں دوسری

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں،

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ نہاں ہو گئیں۔ (وقائب)

شاید اسی سبب سے بہت سے صوفیوں پر جلوی ہونے کا الزام لگایا۔ لیکن ہر گز اس کے اس نکتہ کو سامنی طور پر سمجھنے کے لئے نیچرل سائنس کی ضرورت تھی جس سے ایسا مدلول تک محدود نہ رہا۔ ناچار تغیر و حرکت کو فنا کے ساتھ ہم معنی کر دیا گیا۔ یہ تو صحیح ہے کہ ہر چیز فنا ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ ایک نئی صورت میں بدلتی رہتی ہے، تسلسل زندگی کو ہے فنا کو یہ نکتہ قیامت اور زمان و مکان کے ارضی و سماوی تقسیم نے بھلا دیا۔ صوفی شعر ابھی اس انحطاط کے شکار ہوئے۔ چنانچہ میر اور غالب دونوں کے یہاں یہ طریق کار لٹا ہوا نظر آتا ہے۔ دونوں ہی بقائے راز کو فراموش کر کے فنا کو مقدم کر دیتے ہیں۔

مری تعمیر میں بضم ہے اک صورتِ خرابی کی، ہیولی برقِ خرمن کا ہے خنِ گرمِ ہقل کا (غالب)
 پھرتی ہے اپنے ساتھ لگی متصل فنا، آبِ رواں کا ہم ہوئے نابود ہر جگہ (میر)
 مری نمودنے مجھ کو کیا برابر خاک، میں نقشِ پا کی طرح پائمالِ پناہوں
 مر رہے خاک ہونا، ہو خاک اڑتے پھرنا اس راہ میں ابھی تو دپیشِ مرے ہیں۔

بہر حال اس تحریف و تخریب کا جو کچھ سبب ہو اس قسم کے انحطاطی فلسفے سے حافظ کے زمانے سے الی الحال ہر ایک صوفی شاعر متاثر ہوا ہے۔ اس قسم کے خیالات کی صحتیافت کی جائے کم ہے۔ لیکن جب ایک مخصوص خیال کو پر وہ بنا کر صوفی شعرا کی بھی باتوں کی بھی مخالفت کی جاتی ہے تو پھر یا تو جہل کی موافقت مد نظر ہوتی ہے یا اپنے ذہنی رجحان کا تحفظ، مثال کے طور پر حافظ کا ایک شعر لیجئے۔

آسائشِ دو گیتی تفسیر اس دوحہ ^{مستط} باد و ستاں تطف بادِ شمنانِ مدارا

اس شعر کے بارے میں اگر کوئی شخص اس قسم کی رائے دے کہ جب حافظ نے یہ شعر کہا تھا تو ترقی پسند تھا لیکن اب رجعت پسند ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اسے

یا تو کلاسیکی ادب کے جانچنے کی سائنس نہیں معلوم ہے یا پھر وہ لوگوں کو کلاسیکی ادب سے
 مستفر کرنا چاہتا ہے۔ غلامی سے لے کر سرمایہ دارانہ نظام تک طبقاتی شعور کے مختلف منازل
 رہے ہیں۔ اگر آج کے دور کی طبقاتی جنگ میں جس کا شعور بہت ہی صاف، تیز اور تند ہے
 ہم غلامی کے عہد یا جاگیر دارانہ نظام کے ادب کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو وہ یقیناً ہمیں حقیر
 معلوم ہوں گے۔ ایسی صورت میں ان کی معنوی افادیت کو ابھار کر ان کے جمالیاتی
 خط کو دوبارہ نا خود اپنے ساتھ ظلم کرنے کے برابر ہے۔ کارل مارکس نے یونان کے اساطیری
 ادب اور شکسپیر کو اس نظریے سے نہیں جانچا ہے اور نہ یہ نظریہ ماضی کے ادب عالیہ کے
 بارے میں روس ہی میں رائج ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ ڈکنس کے ناولوں
 میں انسان دوستی کا جذبہ طبقاتی جنگ کے تضاد پر غالب آجاتا ہے۔ آپ ڈکنس کو طبقاتی
 سمجھوتہ باز کہہ سکتے ہیں لیکن اس سے ڈکنس کی عظمت گھٹتی نہیں ہے حالانکہ وہ سرمایہ دارانہ
 نظام کا ناول نگار تھا۔ اسے زیادہ سے زیادہ بورژوا انسان دوست کہا جاتا ہے۔
 اس کا سبب یہ ہے کہ اُس کی دوستی مظلوم طبقے کے ساتھ بہت ہی واضح ہے۔ اگر یہ
 فرض بھی کر لیا جائے کہ ڈکنس کے ناولوں میں جمالیاتی حظ نہیں ہے تو انسان دوستی کے
 جذبہ کے ماتحت سہی ڈکنس روس میں بہت زیادہ مقبول ہے۔ اب آپ ایک سٹیری
 اور اُترے، شکسپیر کا کوئی ڈرامہ ایسا نہیں ہے جس میں اس نے اپنے ہیرو کو مقدس
 ہمنوا نہ کیا ہو۔ بلکہ دیگر اس کا کوئی بھی ہیرو نقدیر کی تخلیق میں غالب نظر نہیں آتا ہے
 شکسپیر کے ہیرو سوویٹ روس کے ہیرو کے شعور کو بیدار نہیں کر سکتے ہیں۔ پھر بھی
 شکسپیر روس میں پڑھا جاتا ہے اور ڈکنس کے مقابلے میں زیادہ جمالیاتی حظ کے ساتھ
 اب آپ اس سے بھی اور ایک سٹیری نیچے اُترے، یونان کا کلاسیکی ادب جس کا

کائناتی نقطہ نگاہ بالکل ہی طفلانہ ہے۔ آج کی دنیا میں کیا افادیت رکھتا ہے لیکن کارل مارکس ہر سال پڑھتا تھا اور اسے انسانیت کے زمانہ طفلی کے حافظے کے نام سے یاد کرتا تھا اسی ادب کے بارے میں کارل مارکس نے یہ کلاسیکی جملہ بھی لکھا ہے۔

”یہ سمجھنا مشکل نہیں ہے کہ یونان کے فنون و ادب اور اس کے ادوار مخصوص قسم کی سماجی ترقی کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ہاں یہ سمجھنے میں یقیناً دقت ہوتی ہے کہ وہ آج بھی کیوں جمالیاتی حظ کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ اور بعض معنوں میں ایک ایسا سمیاد قائم کئے ہوئے ہیں جس کو حاصل کرنا بہت مشکل ہے؟“

یونان کے کلاسیکی ادب کے بارے میں کارل مارکس نے اپنے خیالات کا اظہار کئی جگہوں پر کیا ہے ان سب کو سامنے رکھتے ہوئے اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا ہے کہ ماضی کے ادب عالیہ کے بارے میں کارل مارکس کا نقطہ نظر تاریخی تھا۔ چونکہ اس کی حقیقت میں نگاہیں ایک دور کو دوسرے دور کے ساتھ گڈ ٹڈ نہیں کرتی تھیں اور چونکہ وہ سماجی شعور کے مختلف منازل سے بھی واقف تھا اس لئے وہ جمالیاتی حظ حاصل کرنے سے پرہیز بھی نہیں کرتا تھا۔ آخر ادب کا بھی تو ایک حق ہے، جسے مارکس نے ابدی حق کہہ کر یاد کیا ہے یہ ابدی حق بقول حافظ ہر شخص حاصل نہیں کر پاتا ہے

نہ ہر کہ چہرہ ہر افرودخت دلبری داند؛ نہ ہر کہ آئینہ ساز و سکندری داند

اگر مارکس کا نظریہ صحیح ہے تو یہ مانتا پڑے گا کہ حافظ کا شعر نہ صرف ماضی ہی میں قیام پزیر تھا بلکہ آج کی تاریخ میں بھی حسین ہے۔ کیونکہ وہ جمالیاتی حظ کا سبب بنا ہوا ہے۔ اور جب ہم حافظ کے اس شعر کو مثال کے طور پر پیش کریں تو ہمیں یہ نہ کہنا چاہئے کہ دیکھو ایسا کہو گے تو رجعت پسند ہو گا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اگر یوں کہو گے تو حسین ہو گا۔ لیکن

یہ بات انھیں کے لئے صحیح ہے جو ماضی میں ترقی پسند روایات کے حامل رہے ہیں اور جنھوں نے پرانے کے خلاف جنگ کی ہے۔ کیونکہ حسن ترقی کے ساتھ آمیز ہے۔

اب میں حافظ کا ایک دوسرا شعر پیش کر رہا ہوں ۵

حدیث از مطرب نے گوہر از دہر کمتر جو کہ کس نکشود نکشاید بحکمت این معمارا

یہ واقعی بڑا رجعت پسندانہ خیال ہے کہ جو معما حکمت سے نہ کھل کے بھلا اسے

مطرب کیوں کر کھول سکتا ہے۔ غالباً یہی فلسفہ خیام کا بھی تھا۔ پھر بھی خیام نے ایرانی ادب میں مادی اور حسی فلسفے کو جنم دیا۔ لیکن میں خیام کا سہارا ہی کیوں لوں۔

حافظ کے اس رجعت پسندانہ فلسفے کے بارے میں میراجو آج رد عمل ہے وہ سائنس اور مادی علوم کی بڑھتی ہوئی روشنی کے باعث ہے، جب کہ روز بروز

معنے پر معنے کھلتے جا رہے ہیں۔ کیا یہی بات حافظ کے وقت کے لئے بھی صحیح تھی۔ اگر آپ

حافظ کے وقت کا جائزہ لیں اور یہ بات تیرھویں صدی عیسوی کی ہے جبکہ یورپ

میں بھی اندھیرا تھا۔ تو آپ کو معلوم ہو گا کہ حافظ کے زمانے میں مادی علوم کی تعلیم

ہی نہ ہوتی تھی۔ مدرسوں میں معقولات اور منقولات کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔

معقولات کا دائرہ فلسفہ الہیات تھا اور منقولات کا دائرہ احادیث۔ فلسفہ الہیات

مادی علوم کو بالکل خارج کر دیا گیا تھا۔ مادی علوم کے خلاف یہ جنگ تین سو سال

پہلے سے لڑی جا رہی تھی۔ اس کی ابتدا معتصم باللہ کے زمانے سے ہوتی ہے،

جب کہ مادی علم (لطف یہ ہے کہ اس وقت وحدت الوجودیوں کو بھی مادی علم میں

شمار کیا جاتا تھا) کو نہ تیغ کر دیا گیا اور تمام مادی علوم کی تعلیم پر پابندی لگا دی

گئی۔ اس وقت سے ایران مادی علوم سے دور ہو تا گیا۔ حافظ کے وقت میں تو

خالصاً فقہی تعلیم رہ گئی تھی۔ ایسے ماحول میں اگر حافظ نے فقہی حکمت کی مخالفت کی تو کیا قصور کیا۔ یہاں جب حافظ حکمت کے خلاف رد عمل کر کے مطرب دے کی طرف بڑھتا ہے تو اس کا اشارہ صرف محسوسات کی طرف ہے اور محسوسات علوم کے اولین نیسے ہیں۔ انھیں معنوں میں خیام اور حافظ نے حسی فلسفے کو ایرانی ادب میں داخل کیا ہے۔ یہ ایرانی نیگزیم کی بازگشت تھی جو بالکل ایک مادی فلسفہ تھا ع

گرمی گوید کہ ہست عالم نیست رب (رومی)

مادیت کی بنیادوں کو استوار کرنے کے لئے پہلے اپنے حواس کی قوتوں کو بڑے گا لانا پڑتا ہے۔ مادی علوم الہیاتی منطق کی کوکھ سے نہیں پیدا ہوتا ہے۔ یونان کا مادی فلسفہ یونان کی پیگنزم سے پیدا ہوا۔ یورپ میں بھی نشاۃ ثانیہ کی تحریک کے زمانے میں مفکر طبقہ اور ادیبوں نے پیگنزم سے بے تکان عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ مادی زندگی کی تشریح کو ابھائے بغیر مادیت کا نظریہ مستحکم بھی نہیں ہوتا ہے۔

حافظ کے سامنے مادی علوم نہ تھے۔ وہ خود امام غزالی کے ہاتھوں بیعت کر چکے تھے۔ پھر بھی ان کی شاعری میں ایرانی نیگزیم حسیہ حقیقت نگاری کے روپ میں ابھر آیا ہے۔ مادی حقیقت نگاری حسیہ حقیقت نگاری کے بغیر وجود میں نہیں آتی ہے۔ حافظ کا یہ بہت بڑا کارنامہ ہے کہ اس نے الہیاتی منطق کے خشک طریق استدلال کے خلاف بغاوت کر کے حسیہ اظہار حقیقت سے ایرانی ادب کو مالا مال کر دیا۔ کیا یہ شعر رجعت پسندانہ ہے؟ اس موقع پر میرے سامنے علامہ اقبال کے وہ اشعار بھی ہیں جو انھوں نے کبھی حافظ کے بارے میں کہے تھے مجھے موصوف کی اس تنقید سے اتفاق نہیں ہے۔ کیونکہ جہاں تک حافظ فلاطونی کو سفند ہونے کا تعلق ہے ہر وہ شخص فلاطونی کو سفند ہے جو ماد کو

مخلوق سمجھتا ہے۔ پھر یہ کون سمجھائے کہ حافظ ”صہبائے گسار“ اور مولانا رومی میں کیا فرق ہے کیوں ایک سے خطرے کا اظہار کیا جاتا ہے اور دوسرے کو امام بنایا جاتا ہے۔ کیا اس خیال سے کہ حافظ زیادہ ایرانی اور ننگین ہے۔ تیسری بات اور بھی پیچیدہ نظر آتی ہے۔ علامہ اقبالؒ عرفی کی تتبع کے لئے ہدایت کرتے ہیں اور عرفی حافظ کی شاعری پر ایمان رکھتے ہیں۔ گرجا دندی ہونے والی در قلمیں سخن بندگی حافظ شیرازی باہست کرد (عرفی) ان تمام باتوں میں علامہ اقبالؒ نے ایک بڑی اچھی بات کہی ہے وہ ہے حافظ کی جادو بیانی۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں اس کا چل کر نامشکل ہے اس کی نعمت خطرناک بھی ہے وہ آنے والی نسلوں کو سہل انگاری سے روکتی ہے انھیں بار بار یاد دلاتی رہی ہے کہ خیالات کو منظم کر دینا ہی شاعری نہیں ہے۔ شعر ایک تخلیقی پیکر ہے جو صورت و معنی کے جدلیاتی طریق کار سے ابھرتا ہے۔

پھر کیا عجب کہ کچھ لوگ حافظ سے اس بری طرح متعصب ہو جائیں کہ اگر غزل کے ان خطا پر بات کرنی ہو تو وہ حافظ کا تذکرہ کریں۔

خوشتر آں باشد کہ سرد لبراں گفتہ آید در حدیث دیگران

اب دیکھنا ہے کہ ان غلطیوں کا اصلی سبب کیا ہے جو ذاتی اغراض و مقاصد سے آزاد ہے۔ پہلی غلطی تو مختلف ممالک کے سماجی ارتقا کے سمجھنے میں ہوتی ہے۔ مغرب کا تاریخی ارتقا اور وہاں کا طبقاتی شعور ایشیا کے تاریخی ارتقا اور سماجی شعور سے آگے رہا۔ ہم مغربی تاریخ کے شواہد کو مینکانی طور پر مشرق پر لاگو نہیں کر سکتے اور نہ ہم تاریخ کے مختلف ادوار کو اس طرح خانوں میں تقسیم کر سکتے ہیں کہ گویا ایک تعلق دوسرے سے تھا ہی نہیں۔ اکثر اوقات ہم میکائیک طور پر غلام تہذیب کی پیٹھر پر جاگیر دارانہ نظام اور اس کی پیٹھر

سرمایہ دارانہ نظام کی اینٹ پختہ ہوئے چلے جاتے ہیں اور ان تینوں دور کو ایک معنی میں ایک عہد (EPOCH) سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ذرائع پیداوار اور تہذیب کے مادی وسائل کے بڑھنے کا تعلق ہے ایک دور کو دوسرے دور پر برتری حاصل ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ غلام کے مقابلے میں کھیت مزدور اور کھیت مزدور کے مقابلے میں مل مزدور کی آزادی نسبتاً آگے بڑھتی رہی ہے۔ لیکن ذرائع پیداوار پر ایک مخصوص طبقے کے تصرف حاصل کر لینے سے غلامی کا دور ختم نہیں ہو جاتا ہے تا وقتیکہ وہ طبقہ استحصال کی بنیادوں کو ختم نہ کر دے۔ یہی سبب ہے کہ مارکس نے ان ادوار کو ایک عہد (EPOCH) کے نام سے یاد کیا ہے یہ پورا عہد غلامی کا عہد ہے اس میں استحصال کی شکلیں تو ضرور بدلتی رہی ہیں لیکن استحصال ختم نہیں ہوا ہے۔ انھیں معنوں میں اشتراکی انقلاب اپنے ماضی کے انقلاب سے بہت ہی مختلف ہے۔ یہ فرق ایک بنیادی تبدیلی کا ہے۔ اشتراکی انقلاب کی یہ بنیادی خصوصیت اس طبقاتی شعور کا نتیجہ ہے جسے بورژوا نظام نے بہت ہی تیز کر دیا ہے۔ آج بورژوا نظام کے طبقاتی شعور میں جو تیزی اور تندہی ہے اگر اس کی بنیاد پر آپ جاگیر دارانہ نظام کے طبقاتی شعور کو جانچنے کی کوشش کریں گے تو آپ کو بڑی ناکامی ہوگی۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جاگیر دارانہ نظام میں طبقاتی جنگ یا طبقاتی شعور نہ تھا۔ اس سے صرف اتنا مراد ہے کہ اس وقت طبقاتی شعور اتنا بڑھا ہوا نہ تھا جتنا کہ آج ہے۔ کیونکہ اس وقت لوٹنے والے اور لوٹ جانے والے طبقوں کا تضاد اتنا بھر نہیں پایا تھا۔ جاگیر دارانہ نظام کے بہت سے دبے ہوئے تضاد کو سرمایہ دارانہ نظام نے ابھار رکھا ہے اور بہت سے اس نظام کے دبے ہوئے تضاد کو اشتراکی نظام نے ابھار رکھا ہے۔ میں وضاحت کے لئے ہندوستان

کی تاریخ سے ایک مثال دینا چاہتا ہوں۔ انگریزوں کے آنے سے پہلے دیہات کی زمینوں پر کسانوں کا قبضہ تھا۔ بظاہر ذرائع پیداوار پر تصرف انفرادی تھا۔ لیکن وہ اپنی محنت سے بھرپور فائدہ نہیں اٹھا پاتے تھے کیونکہ پیداوار کا ایک تہائی یا چوتھائی حصہ وہ جاگیردار کو بھی دیتے تھے۔ یہاں چونکہ ذرائع پیداوار پر براہ راست تصرف جاگیردار کا نہ تھا اس لئے جاگیرداروں اور کسانوں کا طبقاتی تضاد بھی اتنا شدید نہ تھا جتنا کہ انگریزی راج میں ہوا۔ انگریزوں کے آنے سے یہاں کے طبقاتی تعلقات میں ایک بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی۔ انگریزوں نے دیہات کی جماعتی زندگی کو تباہ کر کے زمینیں محصول جمع کرنے والے طبقے یعنی زمینداروں کو دیدی۔ اب زمینی ذرائع پیداوار پر براہ راست تصرف زمینداروں کا ہے۔ کیونکہ وہ انھیں بے دخل بھی کر سکتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آج ان کی لڑائی آگے بڑھی ہوئی ہے اور ان کا طبقاتی شعور بہت بیدار ہے۔ آج کی ایسی شعوری آگہی جاگیردارانہ نظام میں نہ تھی۔ لیکن طبقاتی کشمکش تو تھی ہی۔ یہ بات صحیح ہے۔ لیکن اس کشمکش کا اظہار شاہی سیاست میں بھی ہوتا ہے انیگلز لکھتا ہے کہ ”تمام انقلابی عناصر جو جاگیردارانہ نظام کی تہوں میں اٹھتے تھے وہ سب سب شاہی طاقت کی طرف راجح ہوتے تھے اور آخر الذکر ان کی طرف راجح ہوتا تھا۔ ایسی صورت میں جب ہم جاگیردارانہ نظام کی سیاست اور طبقاتی شعور کا پتہ چلانے کی کوشش کریں تو ہمیں بادشاہوں کی سیاست کو نظر انداز نہ کر دینا چاہئے۔ یہ راستہ کافی مشکل ہے۔ یہاں سرکھپانے کی ضرورت پڑتی ہے ہمیں جلد بازی میں کسی بھی استحصالی طبقے کے مفکر کی تنقید قبول نہ کرنی چاہئے۔ کیونکہ وہ اپنے مخالف طبقے کی پول کھولنے میں تو بہت ہی کامیاب رہتا ہے۔ لیکن وہ حقیقت کی تہوں تک نہیں پہنچ پاتا ہے۔ اس کا

استحصالی رجحان حقیقت تک پہنچنے میں ایک پردہ بن جاتا ہے۔ خیر یہ ایک ضمنی بات ہوئی
 ورنہ ستم ظریفی تو اس وقت شروع ہوتی ہے جب کہ میرا در غالب کی شاعری میں کسانوں
 کی بغاوت اور پلاسی کی جنگ کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا ہے تو انھیں رجعت پرست کہہ کر
 الگ کر دیا جاتا ہے۔ تاریخ کا یہ میکا بھی تصور رہیں دوسری قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا
 کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی ہم اشتراکی اور فیوڈل نظام کو دو پلوں میں رکھ کر موازنہ کرنے
 لگتے ہیں اور جب فیوڈل کا پتہ ہلکا نظر آتا ہے تو پھر ماضی کی حسین روایات پر بھی حقارت
 کی نظر ڈالنے لگتے ہیں۔

ماضی کی حسین روایات کو حقارت سے دیکھنے کا جذبہ اصل میں تاریخ کو مٹانے کا
 جذبہ ہے اور تاریخ کو دہی مٹاتا ہے جس میں کچھ احساس کمتری ہوتا ہے۔ وہ تمام ادیب
 اور شعرا جو اپنے فن کو اس حد تک چمکانہ سکے ہیں کہ اپنے کلام میں بھی ایک ابدی حسن
 پیدا کر سکیں۔ ماضی کی حسین روایات کو مٹانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ ادبی حسن کا
 دائم ہی ختم ہو جائے۔ پھر تو ناظم کے لئے میدان خالی رہ جاتا ہے۔

یہ ابدی حسن صرف یونان کے کلاسیکی ادب ہی کے بارے میں صحیح نہیں ہے
 بلکہ ہر دور کی بہترین ادبی تخلیقات کے بارے میں صحیح ہے۔ ہر دور کے ادب کا انظر
 مواد ہی بدلا ہوا ہے بلکہ ہیئت بھی بدلی ہوئی ہے۔ پھر بھی ان کے باہمی امتزاج سے
 جو حسن پیدا ہوا ہے وہ سب کو نصیب نہیں ہوا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کو ماننا پڑے گا
 اور اس حقیقت تک پہنچنے کے لئے ہمیں ادب کے مقتضیات کا پتہ چلانا ہے۔ یہ بات تو
 صحیح ہے کہ ادب مخصوص قدروں اور خیالات کی تبلیغ کرتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس
 تبلیغ کا اثر وقتی ہے یا دیرپا، وہ ہمارے جذبات اور خیالات کو متحرک کر کے ایک دیر پا

عمل کی تحریک کرتا ہے یا صرف وقتی جوش میں لا کر چھوڑ دیتا ہے۔ وہ ہمارے احساسات اور نفسیات کی جوابی صلاحیتوں کو چھوٹا ہے کہ نہیں۔ اس میں اتنی صلاحیت ہے کہ نہیں کہ وہ ہماری نفسیات پر اثر انداز ہو کر ہمیں حالات کے بدلنے اور خود اپنے کو بدلنے میں مدد کر سکے اور ہماری نفسیات کو نئی قدروں سے ہموار کر کے ایک نئی جذباتی تنظیم بھی کر سکے۔ اگر یہ وقت اور صلاحیت کسی شاعر کے کلام میں نہیں ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ قصور ماضی کی حسین روایا کا نہیں ہے، یہ اس کا اپنا بجز ہے۔ اس میں اتنی صلاحیت نہیں کہ وہ اپنے خیالات اور جذبات کو ایسے زندہ اور متحرک سانچوں میں ڈھال سکے جن کی باز آوری سے ہمارے اندر حیات نو پیدا ہو جائے۔ مشاہدے اور تجربے کی بند کمائیاں کھلنے لگیں اور قدم قدم پر صداقت کی داد دیتی جائیں۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر چل کر ہم عوام کو نئے خیال اور نئے معرکے کی طرف اکسا سکتے ہیں۔ یہ اکساہٹ اسی وقت دیر پا ہو سکتی ہے جبکہ وہ شاعری کے مشاہدے اور خیال کی سچائی کو اپنے ذاتی تجربے کی سطح پر محسوس نہ کریں اور انھیں لفظوں تشبیہوں اور تصویروں کے ذریعے محسوس نہ کریں جن سے ان کے حواس آشنا ہیں۔ یہاں ہمیں عوامی ادب اور ماضی کی روایات سے بہت سی چیزیں مستعار لینا پڑیں گی۔ یہ کام جینے اور چنگھاڑنے سے زیادہ پینے اور تپانے کا ہے۔ تقریر کا کام وقتی ہوتا ہے لیکن ادبی شہارے کا اثر دیر پا ہوتا ہے۔ وہ انسانی ذہن میں ریگتے رہتے ہیں ہمیں بار بار اکساتے اور اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے ترغیبی عمل میں ایک ایسی بانداری ہوتی ہے جو کہ گراں کا مقابلہ بھی کر سکتی ہے اور ایسا ہی ادب بھائی ہے جو ملنے کا حوصلہ بھی بھشتا ہے۔ یہ مرتبہ تقریر کو حاصل نہیں ہوا کرتا ہے۔ شعر و ادب کی تخلیق، تصورات کی باز آوری نہیں بلکہ از سر نو تخلیق کرنے کا کام ہے۔ اس پورے طریق کے

مادی اسباب ہیں جنہیں تفصیلات میں سمجھا بھی جا سکتا ہے، انہیں معنوں میں یہ معجزہ بھی ہے اس طریق کار کے سمجھنے میں مشاہیر علم و ادب کے کلام کا مطالعہ بہت مدد کرتا ہے۔ گوہر کی ادب فلاہیر کے ادب سے بنیادی طور پر مختلف ہے تاہم اس نے فلاہیر سے لکھنا سیکھا چیخوف کا فن کسی حد تک حزن و یاس اور افسردگی کا حامل ہے پھر بھی گوہر کی کوہ کھنا پڑا کہ میں جب تمہارے فن سے اپنے فن کا مقابلہ کرتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں قلم سے نہیں بلکہ بانس سے لکھ رہا ہوں۔

یہ ایسی مثالیں ہیں جو شعر و ادب کی تخلیق میں سنگ میل بن سکتی ہیں اور اگر انسان محنت کرتا ہے تو وہ اپنے فن کو اچھ بھی سکتا ہے۔ پھر بھی وہ صرف اسی راستے سے صحیح ادبی تخلیق تک نہیں پہنچ سکتا ہے اسے عوام کی زندگی سے سبق سیکھنا پڑتا ہے اور جب یہ کام زندگی کے کسی انقلابی سوڑ پر انجام دیتا ہے تو اسے ماضی کی ردایات کو جگا نا بھی پڑتا ہے وہ ماضی سے نعرے، نام اور ملبوس سب قرض لیتا ہے تاکہ وہ نئی حقیقت کو عوام کے محبوب ملبوس میں پیش کر سکے۔ آج کا انقلابی شاعر جس حد تک اس حقیقت سے دور ہوتا جاگا عوام سے بھی دور ہوتا جائے گا۔

اچھا شعر کہنا خونِ جگر اگلنے کے برابر ہے۔ اپنی ناکامی پر اور زیادہ محنت کرنی چاہئے نہ کہ لوگوں کو حسن کے معیار ہی سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

منظومات

احمد ریاض

احمد ندیم قاسمی

اختر الایمان

اسرار الحق مجاز

افضل پرویز

بلراج کومل

تاجور سامری

تخت سنگہ

جان نثار اختر

جسپیل ملک

جوش ملیح آبادی

حامد عزیز مدنی

حسن اصرافی

خاطر غزنوی

خلیل الرحمان اعظمی

ساحر لدھیانوی

سرور جعفری

شاد عارفی

ظہیر کاشمیری

عبد الحمید عدم

غلام ربانی تابان

فراق گورکھپوری

فکر تونسوی

فیض احمد فیض

قتیل شفائی

کدال احمد صدیقی

کیفی اعظمی

گوپال متل

صحیح وح سلطانپوری

مجید احمد

محمود جالندھری

مسعود حسین

معین احسن جذبی

ملک حمید

منیب الرحمان

میراجی

ن، م، راشد

احمد ریاض

دوسری دیوار چین!

ہزاروں تیشوں کے عزمِ سپہیم نے اس کو رنگِ شباب سونپا
ہزاروں انتھک جوان ہاتھوں نے اس کو ڈھالا اسے سنوارا
ہزاروں بھرے ہوئے خیالوں نے اس کو نقشِ دوام بخشا
ہزاروں تپتے ہوئے ارادوں نے اس کے ہر نقش کو ابھارا

تختِ ملک و قوم کے واسطے اُچھالا گیا تھا جن کو
انہیں مشقت کے دیوتاؤں کاخوں ڈبو یا گیا ہے اس میں
انہیں جواں سال کامگاروں کی رُوح آواز دے رہی ہے
ہماری محنت ہمارے اخلاص کو سمو یا گیا ہے اس میں
ہمارے ہاتھوں کا وہ عرق جس عرق سے محلوں کا حسن بھڑکا
وہی عرق اس کے ذرے ذرے میں بس رہا ہے مہک رہا ہے
ہمارے جسموں کا سوز اس کی حیاتِ جاوید کا ہے ضامن
ہمارے احساس کی حرارت سے اس کا دامن بھڑک رہا ہے
ہماری اُس جہدِ زیست پرور کو زندگی یوں اُبھارتی ہے

عروسِ تاریخ اس کو دیوارِ چین کہہ کر بچارتی ہے
 ہزاروں جسموں کا خون، ڈھانچوں کی کھاؤ بنیادیں ہوا اس کی
 ہزاروں ماؤں کا پیارا بہنوں کا حُسن اس میں مچل رہا ہے
 ہزاروں بے خانماں شہیدوں کے عزم کی یاد گار ہے یہ
 ہزاروں بچوں کے قہقہوں کا خلوص اس میں گھل رہا ہے

کسی گلستاں فروش مالی نے زینتِ گلستاں کے بدلے
 ہزاروں کلیوں کی لاج کھو دی، ہزاروں غنچوں کا مان توڑا
 کسی ریاکار ناخدا نے بھنور سے کچھ ساز باز کر کے
 فسردہ انسانیت کی کشتی کو عین طوفان میں لاکے چھوڑا
 تحفظِ دین و شانِ ملت کا واسطہ دے کے وقت نے پھر
 انہیں مشقت کے دیوتاؤں سے خونِ ارزاں کی بھیک مانگی
 پھر اپنے پندارِ خسروئی، جاہِ قیصری کے لئے کسی نے
 انہیں جواں سال کا مگاروں سے عزمِ جولاں کی بھیک مانگی
 اور اس طرح ایک اور ”دیوارِ چین“ تاریخ بن گئی ہے
 اور اس طرح پھر ذلیلِ نفرت ”حیات کی رہ میں تن گئی ہے

احمد ندیم قاسمی

وقت

سربراہِ آدرودہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
چاند بتور کی ٹوٹی ہوئی چوڑی کی طرح اٹکا ہے

دامنِ کوہ کی اک بستی میں
ٹمٹماتے ہیں مزاروں پہ چراغ

آسمانِ سرمئیِ فرغل میں ستارے ٹلنے
سمٹا جاتا ہے — جھکا آتا ہے

وقت بیدار نظر آتا ہے !

سربراہِ آدرودہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں

صبح کی نفرتیٰ تنویر چم جاتی ہے
 دامنِ کوہ میں بکھرے ہوئے کھیت
 لہلہاتے ہیں تو دھرتی کے تنفس کی صدا آتی ہے

آسماں کتنی بلندی پہ ہے اور کتنا عظیم
 نئے سورج کی شعاعوں کا مصفا آنگن

وقت بیدار نظر آتا ہے!

سربرآوردہ صنوبر کی گھنی شاخوں میں
 آفتاب ایک الاؤ کی طرح روشن ہے

دامنِ کوہ میں چلتے ہوئے ہل
 سینہ دہر پہ انسان کے جبروت کی تاریخ رقم کرتے ہیں

آسماں تیز شاعروں سے ہے اس درجہ گداز
جیسے چھوٹے سے پھل جائے گا

وقت تیار نظر آتا ہے !
سربر آوردہ صنوبر کی گنخی شاخوں میں
زندگی کتنے حقایق کو جنم دیتی ہے
دامنِ کوہ میں پھیلے ہوئے میدانوں پر
ذوقِ تخلیق نے اعجاز دکھائے ہیں — لہو اُگلا ہے

آسماں گردشِ ایام کے ریلے سے ہر اسماں تو نہیں
خیر مقدم کے بھی اندازہ ہوا کرتے ہیں

وقت کی راہ پہ موڑ آتے ہیں، منزل تو نہیں آ سکتی

جنگ

میں نے دیکھا ہے ٹپکتے رگ آہن سے لہو
 سنگ پاروں سے اُلبتی ہوئی دیکھی ہے شراب
 میں نے دیکھا ہے سر شاخ پہ ہنگام بہار
 آتش گل سے بھلتے ہوئے خود برگِ گلاب
 میں بھی اُس بھڑ میں تھا جو سرِ مقتل آئی
 پادستے دگرے دست بدستے دگرے

مرگِ انہوہ میں بھی جشن کا سامان نہ تھا
 کوئی ایسا نہ تھا جو جامِ مئے تند بھرے
 سر پہ زانو تھا کوئی خاکِ بر تھا کوئی
 محفلِ زیست میں بچتا سا شر تھا کوئی

وسطِ مشرق کی یہ خندق تھی مہت درجن کا
 ان میں سے ایک نے اک روز کہا تھا مجھ سے
 میں نے باندھا تھا کسی شوخ سے پیمانِ وفا
 اُن گھنی پلوں میں وہ پیار سے بھر پور آنکھیں
 دُڈ بآ آئیں، جھلک اٹھیں، ستابے ٹوٹے
 میں تجو رخصت ہوا جلتے ہوئے خسار و بچ
 چھپا گیا شام کا رنگ اور یہ مہارے ٹوٹے
 اُس کے ہونٹوں پہ کوئی بات تھی میں سن نہ سکا
 میں نے مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کہیں روک نہ لے
 کیا خبر کہتی ہو اک موت کا جھونکا آیا
 ایک گولی نے کیا ختم کہ افسانہ سے
 کون اس سوختہ جاں سوختہ تن کا چھوڑو
 بھاگ کر چھپ گئے ہم اپنی پناگاہوں میں
 کھینچ کر ڈال دیا اس کو اسی خندق میں
 دفن تھے جس میں کئی ایسے فسانے کب سے
 دفن ہوتے ہی چلے آئے تھے جانے کب سے !

میں نے سوچا، کبھی مل جائے، کہوں گا اُس سے
 حاکمِ وقت کا منشا تھا — محبت کی جگہ
 اُس کو نفرت ملے، نفرت ہے ابھی لطفِ خرام
 جس جگہ جاؤ وہاں شرق میں بھی غرب میں بھی
 وسطِ مشرق کی زمیں نے تجھے بھیجا ہے سلام

اسرار الحق مجاز

آج

کار فرما پھر مرا ذوقِ غزلِ خوانی ہے آج
 ہر نفس کا ساز گرمِ شعلہ افشانی ہے آج
 پھر نگاہِ شوق کی گرمی ہے اور روئے نگار
 پھر عرقِ آلود اک کافر کی پیشانی ہے آج
 پھر ادھر لب پر قصیدے ہیں لبِ درخسار کے
 پھر ادھر چہرے پہ تابانی سی تابانی ہے آج
 حُسن اس درجہ نشاطِ حُسن میں ڈوبا ہوا
 انگھڑیاں بے خود شمیمِ زلفِ دیوانی ہے آج
 لرزشِ لب میں شراب و شعر کا طوفان ہے
 جنبشِ مژگاں میں افسونِ غزلِ خوانی ہے آج
 وہ نفس کی زمزمہ سنجی نظر کی گفتگو
 سینہ معصوم میں اک طرفہ طغیانی ہے آج

یاں باہیں عالم غرورِ یوسفیت بھی نہیں
 واں زلیخائی بہ عزم چاک دامانی ہے آج
 واں اشارے میں بہک جانا ہی عین ہوش ہے
 ہوش میں رہنا یقیناً سخت نادانی ہے آج
 وہ لبوں کی انگلیں پیٹنے کی سرکش آرزو
 کس قدر آزاؤ ان زلفوں کا زندانی ہے آج
 کش مکش سی کش مکش ہے ہر مذاقِ عاشقی
 کامراں سی کامراں ہر سعیِ اسکانی ہے آج
 حسن کے چہرے پہ ہے نورِ صداقت کی دمک
 عشق کے سر پہ کلاہِ فخرِ انسانی ہے آج
 شوق سے موقع شناسی کی توقع بھی غلط
 میں نے ان کی شکل بھی شکل سے پہچانی ہے آج

افضل پرویز

حکمران کی ساحری

ہمارے ماموں کے باغ میں شہ پسند کے پٹر جھولتے ہیں
 ہم ان کے بھانجے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی بہن کے چہیتے بیٹے
 وہ کتنے ہمدرد ہیں ہمارے

انہوں نے اسکول کی مصیبت سے بیوہ ماں کے جگر کے ٹکڑے
 کو کتنی جلدی چھڑا لیا ہے

اور اپنے آموں کے باغ کی خاص خاص خدمات سونپ دی ہیں
 مزے سے آموں کی چھاؤں میں گو پھیا لے او نگھتے ہیں دن بھر
 ادھر حمید و نسیم و تنجمہ (ہمارے ماموں کے شوخ بچے) پھنسے ہیں
 کالج کی الجھنوں میں

ہماری بگیم بھی ہیں مزے میں
 امیر خانہ سبھی انہیں کے سپرد ہیں

اور ہمارے ماموں اور اُن کی بیگم اور اُن کے بچوں کے اُجلے
 کپڑے چمکتے برتن، دھکتے سیٹ ہیں ہماری بیگم کے دم قدم سے
 بڑی ہی بھولی، بہت ہی کم گو، بڑی سلیقہ شعار ہیں وہ

ہیں نہیں غم، نہیں ہوئی پوری نانا مرحوم کی وصیت
 وہ شوخ نجمہ اک آنکھ بھاتی نہیں ہمیں تو

بلا سے اس بھونڈے اور توندیل خاں صاحبکے بیاہ دی جائے
 ہماری بیگم ہیں مبارک

مگر وہ عفریت، اس کا ہمزاد۔ اس کے تحت الشعور کا دیو جس پہ
 خواب گراں ہے ظاری

کبھی کبھی بڑبڑانے لگتا ہے نیند ہی میں
 ”مجھے کسی پیر کے تنے سے کوئی دفینہ ہی ہاتھ آجائے
 ہزاروں لاکھوں کی میرے حق میں کبھی کوئی لاٹری نکل آئے۔“

تو اپنے ماموں کے باغ سے دس گنا بڑا ایک باغ لے لوں
 فٹن تو کیا ایک کار لے لوں

میں سوٹ پہنوں، شراب اُنڈلیوں

تو میرا ماموں خوشی سے نجمہ کو میرے پہلو میں لا بٹھائے
 مگر یہ آواز ڈوب جاتی ہے خواب کے بحرِ بیکراں میں
 اور اس کے ماموں کے سبز باغ، اس کے سامنے لہلہانے لگتے
 ہیں، ناچتے ہیں

یہ پابریدہ یہ پر شکستہ ارادے، ان کی بساط ہی کیا، اڑان
 ہی کیا

مگر وہ عفریت اس کا ہمزاد اس کے تحت الشور کا دیو
 کسی دھماکے سے یک بیک ہٹر بڑا کر اٹھ بیٹھے، چونک اٹھے
 تو جانے کیا ہو؟!

جنگ

تیرگی میں بھیانک صدائیں اٹھیں
 اور دھواں سا فضاؤں میں لہرا گیا
 موت کی سی سپیدی افق تا افق
 تملانے لگی،

اور پھر ایک دم
 سسکیاں چار سو تھر تھرا کر اٹھیں
 ایک ماں سینہ کو بی سے تھک کر گری
 ایک بہن اپنی آنکھوں میں آنسو لئے
 راہ تکتی رہی

ایک ننھا کھلونے کی اُمید میں
 سر کو دھلیز پر رکھ کے سوتا رہا

ایک معصوم صورت دیکھے سے سر کو لگائے ہوئے
 خواب بُنتی رہی
 منتظر تھیں نگاہیں بڑی دیر سے
 منتظر ہی رہیں
 موت کی سی سپیری افق تا افق
 تملاتی رہی!

تاجور سامری

غزل

پھر کیوں میرے دھندے دین ہیں جھلکے
 تم تو چھلیا ہو چھپ جاؤ گے چل کے
 آج میں تیرے پیار کے ناز اٹھاؤں کیا
 گھاؤ ابھی تازہ ہیں کلیجے پر کل کے
 میرا رونا اور تڑپنا دیکھے کون!
 تم تو سپنے دیکھتے ہو انبر تل کے
 من کے اصلی چھوڑ کا ملنا مشکل ہے
 بے معلوم کناکے ہیں اس جنگل کے
 آخر کوئی بھور بھی ہے اس جیون کی
 رات تو رات یہاں دن بھی ہیں کاجل کے
 من اک چھالا تھا آخر کو بھوٹ گیا
 اب تیری سپیوں سے موتی کیوں ڈھلکے
 مجھ کو یہ اندھیا رات لگے جانا ہے
 کہاں ہو چندا! میرے تارا منڈل کے

تخت سنگ

لال سویرا

وہ دیکھو! گلرنگِ اُفق سے
جہانکا لال سویرا
چھوٹ چلی ہیں رات کی نبضیں
کانپا گھورا اندھیرا
من من میں ہے جیون بھر کے
سکھ سپنوں کا ڈیرا
لہرا بیگا پلِ دوپل میں
ہر جا سُرخ پھیرا
وہ دیکھو! گلرنگِ اُفق سے
جہانکا لال سویرا
(۳)
وہ کانٹوں کی شمشیروں کو
دیکھ کے محلِ غرائے

ایکا ایکی چھوٹ پڑیں گے
(۲)

وہ نایب اٹھے خاک کے ذرے
وہ غنچے مُسکائے

وہ بھاگے کرنوں کے آگے
ٹوہلتی رات کے سائے

وہ آزادی کے سُورج نے
ہر سُورج کو رکھیرا

وہ دیکھو! گلرنگ افق سے
جھانکا لال سویرا

(۳)

ایکا ایکی کروٹ لے کر

وہ محنت کش جاگے

وہ سیلاب سا اُڈا ہر سُورج

وہ ظالم اُٹھ بھاگے

کاتب رہے ہیں دھینوں کے دل

مزدوروں کے آگے

وہ لاکھوں بھوکوں نے مل کر

محوں کو جاکھیرا
وہ دیکھو! گلرنگ افق سے

جھانکا لال سویرا

(۵)

دھرتی پر سب کا حق ہوگا

سُکھ کے دن آئیں گے

محنت کش اپنی محنت کا

خود ہی پھل کھائیں گے

آزادی کے مدھر ترانے

سب مل کر گائیں گے

راہگیروں کو چھو نہ سکے گا

کوئی چور کُشیلا

وہ دیکھو! گلرنگ افق سے

جھانکا لال سویرا

جاں نثار اختر

تابِ سخن

ہند صدیوں کی غلامی سے تو آزاد ہوا
غنچہ دگل کے چٹکنے کی صدا تو آئی
آج ذرات کے سینے میں اندھیرا تو نہیں
اب تو ساحل پہ پیاسا نہیں مڑا کوئی
اب تو محفل میں نہیں حکمِ زباں بندی کا
آج تو زہر بھرے جام نہ پینا ہونگے
اب تو جینے کی تمنا میں نہیں مڑا ہر
کل کے وعدے کہیں شرمندہ ایفا تو نہیں
اب تو دل پر اثر جاوے افزائش نہیں
اب تو پیدا نہیں منصورِ نجات کوئی
اب بھی کیا رشک کے قابل نہیں خلیفہ کشمیر
اس زمین پر بھی کسی روز شفق چھ لگی

تم بھی آزاد ہوئے اہلِ وطن سے پوچھو
پھول بھی کوئی کھلا شاخِ چمن سے پوچھو
جگمگاتی ہوئی تو خیمہ زکرن سے پوچھو
موجہ گنگا لبِ رودِ جمن سے پوچھو
لڑکے خاموشی اور بابِ سخن سے پوچھو
لذتِ نشنگی کامِ دوہن سے پوچھو
دربارِ لاشہ بے گور و کفن سے پوچھو
سادگیہائے بتِ وعدہ شکن سے پوچھو
نو طلسمِ نگہِ سحرِ فگن سے پوچھو
منظرِ مرحلہ دار و رسن سے پوچھو
گلستانِ ارمِ دباغِ عدن سے پوچھو
دوستو! خاکِ شہیدانِ وطن سے پوچھو

جیل ملک

انتظار

نہ جانے کب بہار آئی اور کب چلی گئی!
مجھے تو کچھ خبر نہیں!

نہ جانے کب بہار آئی اور کب چلی گئی!
مجھے تو اتنا یاد ہے

میں انتظار کر رہا تھا اک نئی بہار کا
خزاں نصیب کہہ رہے تھے — آئیگی بہار — اور پھر کبھی نہ جائیگی
مگر نہ جانے کیا ہوا —

اک آتشیں غبار سا ہر ایک سمت چھا گیا
فضائیں شعلہ ریزہ ہو گئیں

دکھی دلوں کی دھڑکنیں کچھ اور تیز ہو گئیں
ہر ایک چیز آگئی اس آتشیں غبار کی لپیٹ میں

نہ جانے کب بہاڑی اور کب چلی گئی!

نہجے تو کچھ تیر نہیں!

میں منتظر ہوں آج بھی اُسی نئی بہار کا

اُسی کے واسطے میں دوڑ دھوپ کر رہا ہوں اتنی دیر سے

خزاں نصیب مدتوں سے جس کی راہ تک رہے ہیں دل

میں اک ہجوم آرزو لئے

جو ایک بار آئے گی تو لوٹ کر نہ جائے گی

جوشِ مِلحِ آبِادی

شاندارِ دعوے

قرونوں کے شاندار یہ دعوے کہ زندگی
 اک مہرِ لایزال سے پاتی ہے روشنی
 جوئے علوم و چشمہٴ حکمت ہے زندگی
 انصاف و عدل و رافت و رحمت ہے زندگی
 ہر اک شکم ہے رزق کا وعدہ لئے ہوئے
 ہر وعدہ ہے فراغتِ ایفا لئے ہوئے
 دنیا نہیں بہشت ہے دارِ سلام ہے
 اک رحمتِ تمام ہے اک فیضِ عام ہے
 تقدیر کا غلط ہے کہ بیٹا ہے آدمی
 قدرتِ شفیق باپ ہے بیٹا ہے آدمی
 اک آبشارِ جود ہے اک بحرِ رحمت
 شبنم کی طرح نرم ہے قلبِ ربوبیت

پل بھر بھی چشم دہریں ہوتی ہے جب کھٹک
دل میر زندگی کا دھڑکتا ہے دیر تک

بھرتی ہے آہ سرد جو لیلائے زندگی
ہوتا ہے چاک سینہ دارائے زندگی

انسانیت کا درد ہے قدرت لئے ہوئے
شاعر کا عشق، ماں کی محبت لئے ہوئے

حشرت کی دھوم دھام ہے ہستی کی ریل پیل
ہستی کا کارخانہ ہے اک شفقتانہ کھیل

پیر مغاں کے فیض سے چھلکے ہوئے ہیں جام
زرّوں کے دل میں نصب ہیں خورشید کے خیام

المختصر تمام یہ دعوے کہ آسماں
روندی ہوئی زمین پہ ازل سے ہے مہرباں

ایں آئینہ گلے و سکندر چو بلبے
المختصر تمام یہ دعوے یہ غلغلے

جھٹلا دیا ہے ان کو غم کا ثنات نے
ان سب کے منہ پہ تھوک دیا ہے حیات نے

حامد عزیز مدنی

پچھلے پہر کا چاند

بیضوی ماہتاب سوئے افق ایک یرقاں زدہ مریض کی آنکھ!
 رات کا طرز، روشنی کا ہرٹ ریگ ساحل سے پُر غلیظ صدف
 بتلائے فریب دیدہ وری صیدِ شورش، اسیرِ خود نگری
 محو صد شیوہ ہائے بال و پری

ایک بنجواب دھند میں ستور اک معلق سجھا ہوا سا تنور
 ذہن میں پُرفشاں ہیں ماہِ سال ربط کی سعی میں ہیں ماضیِ حال!
 پارہ گوشت بر سرِ چنگال !

نہید نے ڈال دی ہو اپنی کند سو گیا ایک ریچھ کے مانند
 ادھر مگر برف کا مہیب لحاف اک خلش رہ گئی ہے زیرِ ناط

راں! شانے کھلے ہوئے موباف

نخست بے جاں بنائو الے ہیں اس کی ضرور بچھانے والے ہیں
سُرخ ہیں اسکے خواب کے دامن تنگ دل تیرگی کا ایک دہن!
قبر و ایوان یا قبا و کفن

کچھ نہ تھا پاس کیا عدم کے لئے اک ترازوئے کیف و کم کے لئے
کیا یہ آوارہ و فسرده روح اک جھائے سفر سے ہے مجروح
راہ میں ملی سکی نہ کشتی نوح!

چندا کچھتے ہوئے غباروں سے اور دھند لکوں کے کوہاروں سے
ماہتاب اور ہمکنار ہوا! میں بھی کیا کیا ذلیل و خواہ ہوا!
آج سورج کا اعتبار ہوا!

حسن اعرافی سہاگے کا گیت

چل رہے سہاگے سر سر سر، چھن چھن باج رہی گھنگرال
 غم سے فضا میں بوجھل بوجھل، در دے چاروں کھوٹ ٹٹھال
 کون سنے جب تک نہ سنائیں، اپنی بیتا، اپنا حال
 چل رہے سہاگے سر سر سر، چھن چھن باج رہی گھنگرال
 (۲)

گورے جوگی نے دلی کے چوراہے پر مین بجائی
 آزادی کی ناگن پھوں پھوں کرتی بل سے باہر آئی
 ناز ناز کر مین بجائی، جھوم جھوم کر ناگن ناچی
 نغمے تیز و تند ہوئے تو گھوم گھوم کر ناگن ناچی
 بستی بستی شعلے بھڑکے، جنگل جنگل لاٹیں لپکیں
 سونے والوں نے گھبرا گھبرا کر اپنی آنکھیں جھپکیں
 پیچھیں گونجیں، اٹھو اٹھو، دوڑ دوڑو، بھاگو بھاگو
 آزادی رہے آزادی رہے، سنہلو سنہلو، جاگو جاگو

پیچھے پیچھے آزادی اور آگے آگے بھڑکیں دوڑیں
 کاریں لپکیں، لاریاں بھپٹیں، انجن چنے، ریلیں ڈریں
 دہشت بھیلی، وحشت جاگی، ہر جانب شمشیریں چمکیں
 نیزے تیرے، خنجر بر سے، لہو بھری کرپانیں دیکیں
 خون سے ندی نالے جل تھے، نجر الجھے پگ پگ پگ
 انسانوں سے جان بچا کر انسان دوڑے دگ دگ گنگ
 پاکستان آئے تو سمجھے جان بچی اور لاکھوں پائے
 لیکن نارے اسامنتی دنیا میں کون کسی کو بھائے
 عزم سے فضائیں بو جھل بو جھل، درد سے چاروں کھنٹ ٹڈھال
 سر سر سر کھینچ سہاگہ، چھن چھن چھن چھنکا ٹھنکا ل

(۳)

سدا چھن جلنے پر نارے! تجھ کو بلا ساقی تو بھینسا
 مجھ کو مثال زلود دہری تہری ٹھوڑیوں ولے آقا
 آقا جو مالک جاگیروں کے اور پیر بھی کہلاتے ہیں
 انسانوں کے حق میں قسمت کی شمشیر بھی کہلاتے ہیں

جو مذہب کے پرے میں تقدیر پستی پھیلاتے ہیں
 اپنے خدائی حق کا چرچا بستی بستی پھیلاتے ہیں
 سینہ تان تان کہتے ہیں ”دیکھ! زمیں تیری ہے کہ میری“
 اس دھرتی پر چالو مولا ہر نگیں تیری ہے کہ میری“
 ہم مزدور، کسان، مزاح، کامے، کمئیں، بھنگی، بابو،
 سب ان کی نظروں میں ہیٹے، سب ان کی نظروں میں بابو
 ان کے کچھ کوں سے زخمی ہے تیرا سینہ، میرا سینہ
 ان کی جاگیروں کا نمک ہے تیرا پسینہ، میرا پسینہ
 ناسے! کب تک ہم اس اپنے گھر میں بھی برباد رہیں گے
 کب تک اپنے خون کے پیاسے ڈھکے چھپے شہادہ ہیں گے
 کیسے بدلے گا جب تک ہم خود ہی نہ بدلیں اپنا حال
 سر سر سر کھینچ سہاگہ، چھن چھن چھن چھنکا گھن گراں

(۴)

نارے! ہم دھرتی کا سینہ چیریں، بوئیں، کاٹیں گاہیں
 اس محنت کے بدلے پائیں گرم آنسو اور ٹھنڈی آہیں

کتنے ہینے محنت کر کے ہم غلے کے ڈھیر لگائیں
 اک دن چودھری صاحب آئیں چھکڑے بھر بھر کر لیجائیں
 سو من کے انبار سے اپنے حصے میں آئیں دس دانے
 یا کھلیانوں پر منڈلاتے بٹوارے والوں کے ترانے
 آندھی آئے، آندھی جاے، اُڑتی دھول رہے خرمن میں
 مٹی دل پھر جاے پل میں اپنی آشاؤں کے چمن میں
 آنکھوں سے اوجھل ہو جاے گندم کا نذرین اُجالا
 میری دُنیا پر چھا جاے حسرت و غم کا بادل کالا
 مٹھی بھر دانوں سے پیارے، تو ہی بتا، کس کس کو پاؤں
 پیٹ بھروں بیوی بچوں کا یا میں اپنی جان بھجالوں
 سگوں میں ڈھالوں غلے کو جیب بھروں سرکارِ وطن کی
 بیوی بچوں کا تن ڈھانکوں فکر کروں یا تیرے بدن کی
 مجبوراً قرضہ لے لے کر ہم زردی اوزارِ خریدیں
 چند ٹکوں کی خاطر طروں والوں کی بیگار خریدیں
 خانم کے باورچی خانے کی ہو کر رہ جاے بیوی

رستہ تکتے پک جائیں آنکھیں، کب روٹی لائے ہوئی
 تیکھے تیکھے سینگوں والے، کب تک ہم بد حال ہینگے
 کب تک ہم مجبور رہیں کہ کب تک ہم پامال رہینگے
 کیسے بدلے گا جب تک ہم خود ہی نہ بد لیں اپنا حال
 سر سر سر کچھنچ سہاگہ، چھین چھین چھنکا گھنگرال

(۵)

بھینسے، تو چپکے چپکے مسکائے، میری منسی اڑائے
 ہم کہیں اپنے وطن سے بھالگ بھاگ تمہاری نگری آئے
 کیا ہم آئے ریگستانوں کی سُنسان خلا بھرنے کو؟
 ریشم پوشوں، توندوں والوں کی اندھی خدمت کرنے کو
 غلہ پیدا کرنے، توندیں بھرنے، خود چھلکے کھانے کو؟
 جاگیروں کی سبز کھاد یا اگر در مسافت بن جانے کو
 ہم آئے کہ ہمارے لہو سے پاک انساں پیمانے بھر لیں؟
 ہم سے حرم، مطبخ، فیکٹریاں، جلیں اور میخانے بھر لیں؟
 پاک انساں دل لینے دل دینے کے طور طریقے سیکھیں؟

حور و غلاماں سے خدمت لینے کے طور طریقے سیکھیں؟
 انکے پاس عمامے بھی ہیں، منبر بھی ہے، دارِ محی بھی ہے!
 ان کے حرم میں برقع بھی ہے، چادر بھی ہے، سارِ محی بھی ہے!
 پاک انساں تو ریتا لانوں، ناز گھروں میں عیش اڑائیں
 ہم سہم سے سپنے بن بن کر کٹیا ہی میں سو جائیں؟
 پاک انساں ہفیلے کمروں میں پنکھوں کے نیچے اڑ گھیں
 ہم تپتے رگستانوں میں جھاڑی جھاڑی سایہ سنو گھیں؟
 پاک انساں صابن مل مل گردن میں سو سو بار نہائیں
 ہم بد بخت غلاطی کے ڈھیروں میں سرسڑ گرد جائیں؟
 بھینسے اتونے ٹھیک کہا ہے ہم بے کھوٹ نہیں ہیں بھائی
 ہمارے دوٹ نہیں ہیں بھائی، ہم مہ دوٹ نہیں ہیں بھائی
 ملت سے غداری کے انعام میں یہ پائیں جاگیریں
 خدمتِ قوم و وطن کے بدلے ہم کو ملیں سو سو تعزیریں
 کیوں جرمِ بسیارِ خوری پر بھی ہیں سزا سے بری وہ تو ندیں
 جو کروٹ کروٹ دنیا کے پالنے والوں کی پت رو ندیں

آقا یاں زسلام برنجند، کیسے شکوے میں لب کھولیں
 زخمی سانپ کی صورت کب تک چپکے چپکے ہی بس کھولیں
 تیری اک ٹکڑ کی بھی تو مار نہیں یہ رستم سائے
 تیرے سینک نکیلے خنجر، تیرے کھر شمشیر ہیں پیائے
 سر سر سر کھینچ سہاگہ، چھن چھن چھن چھنکا گھنگرال
 اب ہم دم لیں گے تو بدل کر اپنی دنیا، اپنا حال

(۶)

میرے نامے، میرے بھینسے اور فلک کی آنکھیں لال
 چل رہے سہاگے سر سر سر چھن چھن باج رہی گھنگرال
 موٹے موٹے اڑیل ڈھیلے گردش گردش گھستے جائیں
 تیرے رگڑے میں آ کر بھس بھس بھس پھس پھس پستے جائیں
 تیرے گردا گرد بھرتی آندھی اور بگولے ناچیں
 پیلی پیلی گرد کے سن سن لہراتے مرغولے ناچیں
 ہر پھیرے میں اکھڑی اکھڑی گھانسی لگی جاتی ہر چرمر
 گھل بل کر جھنکار میں گونجے نامے اور بھینسے کی غوغا

کھیت میں اونچے نیچے سیارہ بھی ہموار ہوئے جاتے ہیں
 آفاق و اطراف دما دم لالہ زار ہوئے جاتے ہیں
 دُور کسی زیتون پہ بیٹھی فاخۃ گلے شمشمشمش
 اس دھرتی پر اب سے ہمیشہ راج کریں گے ہم تم ہم تم
 آج سے ذرہ ذرہ، پتی پتی، کلی کلی خوش حال
 چل رہے سہاگے سرسر سرچھن چھن اج رہی گھنگرال

نقوش
 آزادی نہر

خاطر غزنوی

گیت

اور دبانے سے ابھرے گی گیتوں کی گنجار
 چلتی آندھی رُک نہیں سکتی
 اڑتی بدلی جھک نہیں سکتی
 ننھی لہری روک سے بن جاتی ہیں فی جہان
 اور دبانے سے ابھرے گی گیتوں کی گنجار
 کوئی قلم کو توڑ بھی ڈالے
 ہونٹوں پر پڑ جائیں تالے
 لیکن پھر بھی سانچ کی ہوگی ہر سو جے جے کار
 اور دبانے سے ابھرے گی گیتوں کی گنجار
 اوچھنوں سے ڈرنے والے
 انگلی کان میں دھرنے والے
 اڑتا بچھی قیدی ہو کر اور مچائے رار

اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار
 تانیں گرمی ہو جائیں گی
 لہریں زہری ہو جائیں گی
 چاروں کھونٹ بکھر جائے گی میری ہا ہا کار
 اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار
 لاکھ مٹا، آباد رہیں گے
 گیت سدا آزاد رہیں گے
 پائیل چاہے قید ہو لیکن قید نہیں جھنکار
 اور دبانے سے اُبھرے گی گیتوں کی گنجار

خلیل الرحمن اعظمی

اصنبی سائے

ابھی ہیں آس لگائے یہ زیت کی راہیں
کبھی تو غم کے چراغوں کے پھول برسیں گے

یہ دھوپ چھاؤں یہ پلٹتے ہیں رُپے
یہ اک غبار سا چھایا ہوا فضاؤں پر
یہ آرزوؤں کی دنیا میں سرمی بادل
ہے ایک نیند سی طاری ابھی ہواؤں پر

ابھی تو ان کی طرف سے پیام آیا تھا
مگر فضا میں یہ کیوں ہیں سکت کی لہریں
ابھی تو کان میں گونجتے تھے دُور کے نغمے
طویل خواب میں شاید میں آج ویرانے

کبھی کبھی تو اُمیدوں کا جال ٹوٹا ہے
دلِ حزیں نے پُرنے غموں سے اُکتا کر
مگر نگاہ میں پھرتی رہی وہ اک تصویر
بنالی اپنی محبت کی اک نئی تقدیر

وہ چھٹ رہی تھو دھندلے نگر ہی تھی فضا
وہ جگمگائے تھی قلب و نظر کے بُت خانے
مگر ہے بڑھ چلی کیوں آنکھ کی یہ حیرانی
یہ آہ ہے میں نظر اب بھی کیوں ہی چہرے

نئے افق سے وہی آفتاب نکلا ہے
وہی ہے خوابِ جوانی وہی نگاہِ قہرِ تیل
یہ سوچ میں دل مجبور ہے کہ اب کیا ہو
تلاش کر لیں کوئی ان جفاؤں کی تاویل

بہت دنوں ہیں لرزاں ایضنبی سائے
مگر وہ چشمِ عنایت ہے نیم باز ابھی
ہزار بار جنونِ وفا ہوا عریاں
مگر وہ حُسنِ دو عالم ہے ایک ازا ابھی

ساحر لدھیانوی شکستِ زنداں

چینی شاعر یا نگہ سو کے نام _____
جس نے چیانگ کانگ کی شیک کے جیل میں لکھا تھا۔

”بیس سال قید _____
کاغذ کے ایک پرزے پر لکھے ہوئے چند الفاظ کی بنا پر
ہو سکتا ہے کہ میں بیس سال تک سورج کی شکل نہ دیکھ سکوں
لیکن کیا تمہارا یہ فرسودہ نظام جو لمحہ بہ لمحہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ اپنی موت
کی طرف بڑھ رہا ہے،
بیس سال تک زندہ رہ سکے گا؟“

خبر نہیں کہ بلاخانہ سلاسل میں تری حیاتِ تسم آشنا پہ کیا گزری
خبر نہیں کہ نگارِ سحر کی حسرت میں تمام رات — چراغِ وفا پہ کیا گزری

مگر وہ دیکھ — فضا میں غبار سا اٹھا
وہ تیرے سُرخ جوانوں کے راہوار آئے
نظر اٹھا کہ وہ تیرے وطن کے محنت کش
گلے سے کہنہ غلامی کا طوق اتار آئے

اور لوہے کی سلاخوں میں بدل جاتا ہے ؟
 بیڑیاں روتی ہیں، زنجیریں فناں کرتی ہیں
 کوڑے چبچا اٹھتے ہیں جلا دوں کی خونخواری پر
 دوست، صدیوں سے ہے قائم یہ تشدد کا نظام
 آج اہنسا کے پجاری ہیں محافظ جس کے
 دھارے اس وادئی خاموش میں تھم جاتے ہیں
 آنسو آنکھوں سے ٹپکتے نہیں جم جاتے ہیں
 نالے بے سود ہیں، بیکار ہے فریاد یہاں
 ہم ہیں صید اور ہر اک ذرہ ہے صیاد یہاں
 اپنے ہاتھوں سے تشدد کو مٹانا ہوگا
 آہن و سنگ کی دیوار کو ڈھانا ہوگا

ہو چکے ہیں بند۔ چوٹی کے رسالے آئیں کیا
 جب رسالے ہی نہیں تو شاعری فرمائیں کیا
 تیسرے درجہ کے آمرتے ہیں۔ اُن پر جائیں کیا
 یہ جو طاقتوں میں پڑے سڑتے ہیں کیا کچھ بھی نہیں
 عورتوں کے واسطے... مردوں کے لائق؟ جی نہیں
 جان من؟ جو پی چکا ہوں میں وہ تو نے پی نہیں
 پوچھ سکتی ہوں کہ ٹوٹا ہن پتھر کس لئے
 ”فن برائے زندگی“ جلیوں کے اندر کس لئے
 ”کوزہ“ رجبت پسنداں میں ”سمندر“ کس لئے
 تم نہ سمجھو گی کہ کیا ہے آج اردو کا مقام
 آچکا ہے جس صحافت کا صفِ اول میں نام
 ہندو پاکستان اس پر رکھ رہے ہیں اتہام
 دوست کو دشمن سمجھ لینا ہی دانا ہی نہیں
 کوئی جائز نکتہ چینی وجہ رسوائی نہیں
 معنویت لیجئے۔ الفاظِ پیالی نہیں

ہے وہی زندہ ادب جو ارتقا کو گدائے
 وہ نہیں جو آسماں پر آہ کی تھکلی لگائے
 احمقوں کی شان میں لمبے قصیدے۔ ہائے ہائے
 عہدِ حاضر میں یہ جھانپل ازم چل سکتی نہیں
 ”باز“ کا پرچارہ کہ کے ”چیل“ چل سکتی نہیں
 لوگ کس..... ٹہنی کو کہتے ہیں کہ پھل سکتی نہیں
 خامیوں پر طنز جب قید و قفس کی بات ہو
 سینکڑوں پر جائیگی دو چار دس کی بات ہو
 نظم کہنی چھوڑ دوں کیا میرے بس کی بات ہے
 دو پہر سے آپ میں کچھ شاعرانہ مُوڈ ہے
 پینسل کب تک بنے گی والہانہ مُوڈ ہے
 چھت کا نظروں کو بنایا لہجہ شانہ — مُوڈ ہے

ظہیر کا شمیری

پاگلو!

ہی ہی ہا ہا

ہو ہو ہو ہو

پاڈ کی

کھینچا تانی

دھینکا شتی

یہ سب کیا ہے

پاگل خانہ

سب کا گھر ہے

سب کا دامن

اپنا سمجھو

شور نہ ڈالو

میزنہ توڑو

دیواروں کی

میل اتارو

اس میں رہ کر

جینا سیکھو

اس سے نجات کر

بھاگ سکو گے؟

بھاگ بھی جاؤ

کہاں رہو گے

اس کے علاوہ

پاگل خانہ

کوئی نہیں ہے

عبدالحمید عدم

غزل

درد کی واردات ہے پیلے
 تیری آنکھوں کا بھی بھروسہ کیا
 کون اس سلسلے کو ختم کرے
 آنکھ کی ہر حسین نادانی !
 صبح محشر تو آہی جائے گی
 زندگی کے ستم کو کیا کہئے
 بات سن لے ترا بھلا ہو گا
 مستقل موت کی تمنا ہے
 داستانِ حیات ہے پیلے
 عالمِ حسادت ہے پیلے
 تیری زلفوں کی بات ہے پیلے
 رونقِ کائنات ہے پیلے
 رات کٹنے کی بات ہے پیلے
 صورتِ واقعات ہے پیلے
 درد مندوں کی بات ہے پیلے
 آرزوئے حیات ہے پیلے

ہم عدم اور بادہ پیمائی
 کہنے سننے کی بات ہے پیارے

غلام ربانی تابان

جیل میں کسی کا خط پا کر

فصل بہار میں بھی سیرِ فتنوں میں
 رنگِ فریبِ کوش کو ہے میری جستجو
 تکتے ہیں میری راہِ خیابانِ کیفِ خیز
 جیسے فسردہ ہو گئی بزمِ صدا و ساز
 سونے پڑے ہیں منبر و محرابِ سیکدہ
 لے دوستِ علم کے گہرے اندھیروں میں آج بھی
 یہ اور بات ہے کہ وہ منہ سے نہ کہہ سکے
 ہیں میرے انتظار میں گیسوئے شامِ خیز
 اب بھی کھلا ہوا بابِ ہم میری واسطے
 جو میرے انتظار میں ہیں ان کو کیا خبر
 اُٹھتی ہیں بار بار نگاہیں مری طرف
 شعر و شراب و نغمہ و روانِ تابکے

گلزار کی فضا کو مرا انتظار ہے
 بوئے گرنیزہ پا کو مرا انتظار ہے
 دشتِ جنوں فرا کو مرا انتظار ہے
 یارانِ خوشنوا کو مرا انتظار ہے
 زندانِ با صفا کو مرا انتظار ہے
 اک اخیر و وفا کو مرا انتظار ہے
 اس پیکرِ حیا کو مرا انتظار ہے
 چشمِ سحرِ نما کو مرا انتظار ہے
 اب بھی مرے خدا کو مرا انتظار ہے
 تہذیبِ ارتقا کو مرا انتظار ہے
 جمہورِ ایشیا کو مرا انتظار ہے
 اب عرصہٴ وفا کو مرا انتظار ہے

فراق گود کھپوری بزم برشکال

مطرب سے کہو آج اس انداز سے گائے
وہ سوز جوتا ریکیوں میں شمع جلائے
پلکوں کے تلے میکہ راز کے جلوے
کو نہ ہو گداز آفت یہ تبسم کی گھلاوٹ
وہ مستی قامت کہ گھٹا جھوم کے اٹھے
وہ نرم کلانی کہ سکوت آنکھ اٹھا دے
وہ شوخی محتاط کے بچے سمجھے انداز
یہ کلم نگہی چشم فوں ساز کی کیسی،
نس نس میں کوئی جیسے دبی چٹکیاں بھر
زلزل عرق آلود کی وہ تاروں بھری رات
کہوں تیرے غم بھر میں نمناک میں ملکیں
برسات کی اس رات میں دوست تری یا

ہر دل کو لگے چوٹ سی ہر آنکھ بھرائے
وہ ساز جو سوئی ہوئی یادوں کو جگا لے
ظلمت میں گناہوں کے چراغوں کی جلائے
لہجے کی کھٹک لو جو تاروں کے چرا لے
وہ ہستی ہر عضو کہ بجلی کو غش آئے
آہستہ خرامی کہ فضا و جد میں آئے
دنیا بھی نہ رہنے دے قیامت بھی نہ ڈھالے
دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنائے
رگ رگ میں کلی جیسے چٹکتی چلی جائے
روئے شفق آمیز سے پو پھونستی جائے
کیوں یا د تری آتے ہی تائے نکل آئے
اک تیز چھری ہے جو اترتی چلی جائے

کچھ ایسی بھی گدڑی ہیں ترے بھر میں راتیں
دل درد سے خالی ہو مگر نیند نہ آئے

فیض احمد فیض

شورشِ بر لبِ دہلی

پہلی آواز: ”اب سعی کا امرکاں اور نہیں پرواز کا مضمون ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے مہتاب پہ شجوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کے لئے ان آنکھوں سے کیا پیاں کیجے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکین دلِ ناداں کیجے
شیرینی لبِ خوشبوئے دہن اب شوق کا عنوان کوئی نہیں
شادابی دلِ تفریحِ نظرابِ زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو اب ان میں الجھ کر کیا کر لیں گے
اک موت کا دھند اباتی ہے جب چاہیں گے پٹالیں گے
یہ تیرا کفن وہ میرا کفن یہ میری لحد وہ تیری ہے“

دوسری آواز: ”ہستی کی متاعِ بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ لبِ لبَل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا

یہ نیرم چراغاں رہتی ہے اک طاق اگر دیراں ہے تو کیا
 افسردہ ہیں گرا یام ترے بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
 ٹھہرے نہیں موسمِ گل کے قدم قائم ہے جمالِ شمس و قمر
 آباد ہے وادی کا کل و لبِ شادابِ حسینِ گلگشتِ نظر
 مقسوم ہے لذتِ دردِ جگر موجود ہے نعمتِ دیدہ تر
 اس ذوقِ نظر کا شکر کرو اس دیدہ تر کا شکر کرو
 اس شام و سحر کا شکر و ان شمس و قمر کا شکر کرو

پہلی آواز :- گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر ان شمس و قمر کا کیا ہوگا
 رعنائیِ شب کا کیا ہوگا اندازِ سحر کا کیا ہوگا
 جب خونِ جگر برفاب بنا جب آنکھیں آہن پڑتی ہیں
 اس دیدہ تر کا کیا ہوگا اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
 جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے نعموں کی طنائیں ٹٹکیں
 یہ ساز کہاں سر بھڑکیں گے اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا
 جب کنجِ قفسِ مسکن ٹھہرا اور جب وگریاں طوقِ در سن
 آئے کہ نہ آئے موسمِ گل اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دوسری آواز:- یہ بات سلامت ہیں جب تک اس خوں میں حرارت ہے جب تک
 اس دل میں صداقت ہے جب تک اس نطق میں طاقت ہے جب تک
 ان طوقِ سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورشِ بربط و نئے
 وہ شورش جس کے آگے زبوں و مامہِ حشمتِ قیصر و کے
 آزاد ہیں اپنے فکر و عمل بھر پور خنزیرِ ہمت کا
 اک عمر ہے اپنی ہر ساعت امروز ہے اپنا ہر فردا
 یہ شام و سحر یہ شمس و قمر یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
 یہ مال و حشم یہ لوح و قلم یہ طہل و علم سب اپنے ہیں

قتیل شفائی

غزل

احترام لب و رخسار تک آ پہنچے ہیں
 بوالہوس بھی مرے معیار تک آ پہنچے ہیں
 جو حقائق تھے وہ اشکوں سے ہم آغوش ہوئے
 جو فسانے تھے وہ سرکار تک آ پہنچے ہیں
 کیا وہ نظروں کے جھروکے میں معلق کر دیں؟
 جو ترے سایہ دیوار تک آ پہنچے ہیں
 اپنی تقدیر کو روتے رہیں ساحل والے
 جن کو آنا تھا وہ منجدھار تک آ پہنچے ہیں
 اب تو کھل جائے گا شاید زری لفت کا بھرم
 اہل دل جرأتِ اظہار تک آ پہنچے ہیں!
 ایک تم ہو کہ خدا بن کے چھپے بیٹھے ہو
 ایک ہم ہیں کہ لبِ دار تک آ پہنچے ہیں

کمال احمد صدیقی

خلوت سے انجمن تک

حسین ہے یہ زندگی — ہزار ہا بہت حسین ہے !
 پھر ایک بار تدم اور نحیف ہوتی جا رہی ہے روشنی !
 یہ صُبح، صُبح نو ہے پھر بھی خون ہے کہیں رات جاگ اُٹھے
 — یہ کیا پھر تو ہمارے جاگ اُٹھے ؟
 مچل رہے ہوں جیسے ساحلی نظارے موجِ پاش پاش میں !
 خود اپنی روح اپنے ہی مزاج کے لئے ہوں اجنبی،
 میں آج بھی ہوں اپنی ہی تلاش میں،
 میں خود سے دُور ہوں، مگر میں خود کو پا ہی لوں گا — یہ مجھے یقین ہے !

متاعِ حس کو دفن کر دیا شکستگی نے ماندگی و اضطراب کے غبار میں !
 نشاطِ حُسن سے الگ، حیات کے خمار میں

میں جاگتا رہا ہوں رات بھر سحر کے انتظار میں
 خمار ایک گہری نیند بن کے رہا ہے لوریاں مرے شعور کو
 گمراہ گذر رہی ہے وسعتِ زمین و آسماں مرے شعور کو
 حصار میں لے ہوئے ہیں سیکڑوں ہزاروں زلزلے اور آندھیاں
 مرے شعور کو!

یہ میں نے کب کہا کہ مجھ کو انتشار چاہیے، جنون چاہیے؟
 ہوں مبتلا عجیب کش مکش میں، خلفشار میں:
 پکارتی ہے زندگی!
 بلا رہی ہے تیرگی!

میں صبح نو سے مطمئن نہیں ہوں، میری زندگی کی جدوجہد ارتقا ہے
 اک نئی بہار کی،
 یہ صبح، صبحِ نو نہیں ہے — دوپہر ہے عین دوپہر ہے ریگِ ناز کی

مرا جنون زندگی نہیں — مجھے سکون چاہیے —
 مجھے وہ نیند چاہیے کہ جس میں زندگی کے خواب ہوں،

جہاں زمین ہو، مگر زمین کے تمام ذرے آفتاب ہوں،
 وہ خواب چاہتا ہوں جو زمین کے شعور کو عزیز ہیں،
 ہر انفتلابِ کامیاب کے غرور کو عزیز ہیں!
 — مگر وہ نیند لے کے کیا کروں کہ جس میں کوئی خواب ہی نہ ہو
 تسلیوں کے واسطے حضورِ خاطر سکوں، دبے ہوئے نگاہ و لمس
 کے حسین جذبہ ہائے زندگی کا اجنبی سا اضطراب ہی ہو!
 اگرچہ بے نمود ہے،

مرے لئے کوئی وجود ہے تو میرا ہی وجود ہے!
 سکون! روشنی ہے خود مرے وجود کی
 سکوت! روشنی نہیں ہے، دود ہے!
 — یہ پچھلی رات کا خمار تو جمود ہے!
 سکوت لے کے کیا کروں، مجھے سکون چاہیے!!

ہر ایک منظرِ حیات دفعتاً بدل گیا،
 وہ آفتاب ڈھل گیا،

اُنڈ کے آگئیں ہر ایک سمت سے وہ اودی اودی بدلیاں،
ہوائیں سرد ہو گئیں،

فضائیں بے نیاز گرد ہو گئیں،
اور ایک سرخوشی تمام سطح خشک وتر پہ چھا گئی!
یہ کونپلیں، یہ کلیاں اور یہ پتیاں

ابھی اُنی ہوئی تھیں گرد میں، پھوار میں نمائیں تو نظارہ خیز ہو گئیں!
پھوار میں تیز ہو گئیں!

برس رہا ہے مینہ خوب زور سے!

— یہ آفتاب جو کہ مغربی افق کی وادیوں میں اب سوئے زوال ہے،
تھکن سے چور چور ہے، ندھال ہے،

یہی تو چشمہ حرارتِ حیات ہے،

یہی تو صدرِ بزمِ ممکنات ہے،

وگرنہ برشگال کا کوئی خدا نہیں، صنم نہیں،

یہ مینہ آسمان کا کرم نہیں،

یہ مینہ خود زمین کے سمندروں کا اک اُبال ہے!!

ہزاروں چہرے، جن کو جانتا ہوں میں،
 یہ مینہ کی پھوار اُن کے اشک ہیں،
 وہ اشک جوز میں کی قوتوں کو نذر کر رہے ہیں تحفہ نمُو،
 زمانہ مانتا ہے (مانے یا نہ مانے) اُن کی شخصیت کو مانتا ہوں میں،
 اور اُن کی منزلیں میرے لئے مقام ہائے رشک ہیں!
 وہ چہرے اختراعِ ذوق و ذہن و فن نہیں،
 (نہ خلقِ ساغر و سبو)

وہ راہب و شیوخ و برہمن نہیں،
 کبھی کیا تھا جذب جن کو زندگی کی آڑ میں شور نے،
 اُنھیں کو دس لیا تھا گردشِ عبور نے،
 اُنھیں کو آج دیکھتا ہوں بادلوں کی آڑ میں!
 وہ ندیاں جو خشک ہو گئی تھیں، اُن کے آنسوؤں سے اگئی ہیں بارشیں!!
 — یہ چہرے آج کی حقیقتوں سے دُور ہیں
 کبھی یہی حقیقتوں کا رُوپ تھے

یہ آج کی مصیبتوں سے — تلخیوں، مسرتوں سے دور ہیں،
 جو آفتاب ان کے سامنے طلوع ہو نہیں سکتا تھا، یہ کبھی اس آفتاب کی دُور تھے

یہی کبھی حقیقتوں کا رُوپ تھے!

حقیقتیں! کہ جو گزر گئیں،

حقیقتیں! — یہ آج کی محبتیں، یہ نفرتیں

حقیقتیں! — یہ آرزوئیں اور حسرتیں

حقیقتیں! — یہ پستیاں، یہ عظمتیں

حقیقتیں، جو اپنا کام کر گئیں،

انہیں کا عکس ہیں یہ آج کی حقیقتیں!

— یہ چہرے کس قدر عجیب ہیں؟

ہیں آج کی حقیقتوں سے دُور، اور مرے قریب ہیں،

یہی تو میرے خواب ہائے منتشر کی کائنات ہیں،

تصورِ حیات ہیں!!

ہوا کی نرم گامیاں،

پھوار اور بوندیاں،

تھمی تھمی، رُکی رُکی سی آہٹیں،

دبی دبی سی سسکیاں !
 یہ میرے دل کی دھڑکنوں کے سارے پر حیاتِ نو کی مسکراہٹیں !
 یہ اجنبی نہیں ہیں میرے واسطے ، میں ان کا راز داں ہوں ،
 ان کو خوب جانتا ہوں !

یہی مری حیات ہیں ،
 یہی جہانِ خواب کی طلسمی کائنات ہیں !!

حیاتِ ما سوا کی آرزو نہیں ،
 فضائے ماوراء کی آرزو نہیں ،
 مجھے کسی صنم ، کسی خدا کی آرزو نہیں !
 مجھے خود اپنی ہی تلاش ہے ،
 خود اپنی ہی تلاش میں

سمندروں میں ماہتاب و کمکشاں کا رقص دیکھتا رہا ہوں میں
 اور اوس کے ہر ایک قطرہ میں شگفتگی گلستاں کا عکس دیکھتا رہا ہوں میں !
 میں دیکھتا رہا ہوں ہر نظارہ میرے ذہن پر مری نگاہ کی خراش ہے !

مری نگاہ گرد و پیش کی حیات پر صد اقتوں کی ٹہر ہے
مگر مراد جو دہمی تو گرد و پیش کی حیات کے بغیر صرف ایک کُہر ہے!!

————— بہارِ گلستاں میں میری زندگی کا رنگ ہے
خود اپنی الجھنوں سے اب نجات پا چکا ہوں میں،
حیات، اور نئی حیات پا چکا ہوں میں،
خود اپنی ذات کی تلاش تھی اور اپنی ذات پا چکا ہوں میں!
————— مرا سفر سمندروں کا جلت رنگ ہے،

میں کا سیلاب جستجو ہوں، کائنات پا چکا ہوں میں!
ہزار ہا کہ عرصہ حیات آج تنگ ہے،
مگر مجھے یقین ہے، یہ زندگی جو اتنی شوخ و شنگ ہے،
اس کے ہات سے سمٹتے دائروں کا ہر حصار ٹوٹ جائے گا،
روایت و قیود کا خمار ٹوٹ جائے گا!
خرامِ زیست کی ہیں منتظرِ طویل اور عریض وسعتیں،
مسترت سکونِ روانائی کے لئے ہیں مضطرب بھی ہزاروں ہی حقیقتیں!!

میں انجمن کا ایک فرد ہوں، اور انجمن مجھے عزیز ہے!
 مجھے اس انجمن کو لوٹنے کی آرزو نہیں،
 فرامیری خوشنہیں،

ہے خودکشی گناہ میرے واسطے،
 یہ انجمن ہے گوشہ پناہ میرے واسطے،
 حیات میرا فن ہے — اپنا فن مجھے عزیز ہے! —
 میں چاہتا ہوں انجمن کی زندگی —
 اور انجمن کی دلکشی —

سُہرے اور رو پہلے جال توڑ دے،
 جو ہونما کے رقص کے لئے وہ تال توڑ دے۔ !!
 میں چاہتا ہوں انجمن میں نعمتِ حیات جاگ اُٹھے،
 شعورِ کائنات جاگ اُٹھے — !!!

کیفی اعظمی

ٹرنک کال

آج اُس نے کیا تھا فون مجھے
 اُس کی آواز سُن رہا تھا میں
 نرم لہجے، مہکتی سانسوں کے
 پھول ہنس ہنس کے چُن رہا تھا میں
 وہ کناٹے، اشارے، تلمیحیں
 وہ لگاوٹ، وہ لذتِ تقریر
 کیسٹنچ دی تھی فضا کے سینے پر
 شوخ فقروں نے تقریسی لکیر
 آرہا تھا ہوا کی لہروں پر
 لبِ نازک کی لرزشوں کا پیام
 میں نے بے اختیار چوم لیا
 چھلکا چھلکا ہوا سازنگیں جا

ذہنِ انساں نے کر دیا آزاد
 سب پیادوں کو سب سواروں کو
 اڑ گئے نامہ بر کبوتر آج
 سونپ کر راز برق پاروں کو
 کچھ نہیں وقت و فاصلہ لیکن
 فون "انجیج" کاروبار میں ہے
 دستِ انساں کی ہر حمیں ایجاد
 اہلِ دولت کے اختیار میں ہے
 روز اُس کا پیام آئے گا
 روزِ مژدہ نیا سنائے گی
 فون کرنے کو ناز نہیں کوئی
 جب پڑوسی کے گھر نہ جائے گی
 آج اس نے کیا تھا فون مجھے
 اس کی آواز سن رہا تھا میں

گوپال متل

صبح کاذب

یہ جو اک نور کی ہلکی سی کرن پھوٹی ہے
 کون کہتا ہے اسے صبح درخشاں اے دوست
 مجھ کو احساس ہے باقی ہے شبِ تار ابھی
 لیکن اے دوست مجھے رقص تو کر لینے دے
 کم سے کم نور نے اُٹا تو ہے اک بار نقاب
 ایک لمحے کو تو ٹوٹا ہے طلسمِ شبِ تار
 اس سے ثابت تو ہوا صبح بھی ہو سکتی ہے
 پردہٴ ظلمتِ شبِ چاک بھی ہو سکتا ہے
 صبح کاذب بھی تو ہے اہل میں دیباچہٴ صبح
 صبح کاذب بھی تو ہے صبح درخشاں کی نوید
 ایک اعلان کہ ہنگام و دارعِ شب ہے
 قافلہٴ نورِ سحر کا ہے بہت ہی نزدیک
 جلد ہونے کو ہے خورشید درخشاں کی نمود

مجرّوح سلطانپوری

غزل

آنکل کے میدان میں دوزخی کے خانے سے کام چل نہیں سکتا اب کسی بہانے سے
 سنتے ہم تو کیا سنتے اک بزرگ کی باتیں صبح کو علائقہ کیا شام کے فسانے سے
 خود کشتی ہی راس آئی دیکھ بد نصیبوں کو خود سے بھی گریزاں میں بھاگ کر زمانے سے
 ہیں اسی سے وابستہ یہ چین کے ہنگامے گلستاں عبارت ہے میرے کشیاں سے

قطعہ

سُرخ انقلاب آیا دو برِ آفتاب آیا
 منتظر تھیں یہ آنکھیں جس کی اک زمانے سے
 اب زمین گائے گی "ہل" کے ساز پر نغمے
 وہادیوں میں ناچیں گے ہر طرف ترالے سے
 اہل دل اگائیں گے کھیت میں مہ و انجم
 اب گہر سبک ہو گا ایک جو کے دانے سے

منچلے بنیں گے اب رنگ و بو کے پیراہن
 اب سنور کے نکلے گا حُسن کا رخانے سے
 عام ہو گا اب ساتھ ہی سب یہ فیضِ فطرت کا
 بھر سکیں گے اب دامن ہم بھی اس خزانے سے
 عشق کی کسے فرصت دو رہیں مجھ آج زخمِ سر بہر دل پہ چوٹ کھانے سے

سویرا
 غاص بہر

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

تنگ پگڈنڈی — سر کسار بل کھاتی ہوئی،
 نیچے، دونوں سمت، گہرے غار، منہ کھولے ہوئے
 آگے ڈھلوانوں کے پار اک تیز موٹر — اور اس جگہ
 اک فرشتے کی طرح نورانی بہ تو لے ہوئے،
 جھک پڑا ہے آگے رستے پر کوئی نخل بلبند
 تمام کر جس کو گزر جاتے ہیں، آسانی کے ساتھ
 موٹر پر سے، ڈگمگاتے رہروں کے قافلے،
 ایک بوسیدہ خمیدہ پٹر کا کمزور ہاتھ
 سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امین،
 آہ ان گردن فرازاں جہاں کی زندگی —
 اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنھیں حاصل نہیں

محمور جا لندھری

اُونچی دکان، پھیکا پکوان

وہ منتظر ہیں

کہ میں سناؤں عظیم ہندوستان کا نغمہ
جہی ہوئی دکھتا ہوں میں جن چوٹیوں پہ کوڑھ کی سپیدی

وہ چاہتے ہیں

میں اُن ہمالہ کی چوٹیوں پر بلند وسیں کس دکھا دوں
سیاہ پتھر جو دکھتا ہوں

انہیں بتا دوں کسی حسینہ کی نازیں انگلیوں میں نیلیں نیگنے
نکار ہندوستان کے سینہ پہ بہہ رہے ہیں لہو کے دو تیز گام دھاسے
وہ چاہتے ہیں

میں گنگا جمن کی رگزاروں میں نور نگھلا ہوا بچھا دوں
چمکتے پتیل کو زربنا دوں

میں ————— "کائیں کائیں" کو مست "کو، کو" کا نغمہ جانفزا بنا دوں

بتا رہے ہیں —————
مبالغہ ہی کمالِ فنِ سخنوری ہے

(۲)

دوتاک میں ہیں

فریب کھا جاؤں اور پھر اپنے حلقہٴ اقتدار کو بھی فریب دیدوں
دکھا چکا ہوں جنہیں اُجالا اُنھیں تیرہ روز یوں کے سپرد کردوں
یہ رُوحِ فرسا گناہ سرزد کبھی نہ ہوگا
اُٹھاؤ کاغذ کے یہ تراشے!

کہ جن پہ شاہنشتی کے دھتے ہیں ثبتِ اب تک
کہ جن سے ذلتِ فراغلامی کی بُبستور آرہی ہے
کسی بھی قیمت، کسی بھی اُجرت پہ میری دُنیائے غم میں کبھی نہیں صدا
ہٹاؤ ————— یہ زر نگار منصب!

یہ کنبہ پرور ————— یہ حرصِ افروز ————— اور یہ رشوتِ طلبِ دہیج!

کہ سنگِ ریزے کو سنگِ ریزہ کہوں گا میں تو
اُٹھاؤ ————— پستولِ بود و میرِ نحیف سینے میں معدنی بیجِ گولیوں کے
صلیب پر کھینچ دو مجھے کیل ٹھونک دو میری خستہ قسمتِ تھیلیوں میں
لگا دو میرے لبوں سے بس کا بھرا پیالہ

کہ سنگ ریزے کو سنگ ریزہ کہوں گائیں تو

(۳)

جو تاب ضربِ خلوص کی لاسکو تو پھر میں تمہیں سناؤں
حقیر ہندوستان کا نعمہ!

نظر اٹھاؤ!

تمہیں ضیا بار کر سہوں پر غلیظ مٹی کے بُت ملیں گے
جو اپنے منصب کے عہد کو لمحہ غنیمت سمجھ رہے ہیں
نچوڑتے ہیں لہو جو افلاس کے نچوڑے ہوئے بدن سے
پرے وہ دیکھو!

مکان کھڑے ہیں — کہ جیسے اپنی عدم تباہی پر شرم سے نیچے آ رہینگے
یہ گھر ہیں آزاد ہستیوں کے

مقیم انسان ہی نہیں ان میں لکھیوں، مچھروں کے اُڑتے ہجوم بھی ہیں
ذرا سا اور ان کے پاس آؤ!

نسلِ آدم کے آشیاں ہیں کہ — کہنہ امراض کے گھروندے؟
ادھر بھی دیکھو!

یہ شاہراہِ طویل ہے جیسے کوئی اُدھڑی ہوئی چٹائی
شکستہ راہیں نہ جانے کس طرح ہوں گی منزلِ ناتعجب!

یہ جن منازل کی شاہراہیں ہیں وہ منازل بھی خوب ہوں گی
 شکستہ راہوں کے رہنما کو جو قابلِ اعتماد سمجھے تو راہرو کی ستم نصیبی؛
 اُٹھو مجھے فیصلہ سُنادو!

لگا دو میرے لبوں سے بس کا بھرا پیالہ
 کہ سنگ ریزے کو سنگ ریزہ کہہ رہا ہوں

چند ن
 سالنامہ

مسعود حسین خاں (دوینم)

غزل

ابھی سپن میں کوئی نکتہ کار باقی ہے
یہ انتظار کی گھڑیاں کناں جوئے چشم
تھامے سُرخ پہ میں کچھ اجنبی نظر کے نشا
طلسمِ غیر نہیں تارِ عنکبوت سے کم
سنا ہے ہند کی شاداب دیوں میں فیترا
عجب نہیں ہے کہ شبنم سے موت ہو جائے
وہ تو بہار سلامت رہے بتائیں کیا
رفو کی بات پہ وہ شوخ ہنس کے یوں لہلا
بہار باقی ہے زخمِ بہار باقی ہے
امید و دُوب چکی اعتبار باقی ہے
تمہارے ابرو پہ ہلکا سا بار باقی ہے
ہزار ٹوٹ چکا ہے ہزار باقی ہے
بہار آ بھی چکی ہے بہار باقی ہے
گلوں کی تشنہ لبی بے شمار باقی ہے
کہاں سے دامن گل داغدار باقی ہے
ابھی توجیبِ گریباں میں تار باقی ہے
مری بہار کی آسودگی میں اے مسعود
سنا ہے تو ہی فقط بے قرار باقی ہے

معین احسن جذبی

غزل

دل میں کچھ سوزِ تمنا کے نشاں ملتے ہیں
وہی دیوانگی شوق، وہی تیشہِ غم
آج بھی کھیلوں کے خسار ڈرا جاتا ہے رنگ
آج بھی ریگِ بیابان کے تیشِ نازوں میں
آج بھی حتم اسی طرح نگار و مجروح
آج بھی دل ہیں کہ ہو حشر کا و حو کا جن کا
آج بھی سر سے گزر جاتی ہیں امواجِ بلا
ہاں اسی منزلِ صدِ کیف و طرب کی تہا
اے مرے ہمسفر! اس کو تو منزل نہ کہو
ان کے ہر وعدہِ الطاف کی رنگینی میں
انکی محفل میں وہ پہلے ہوئے ہمیں نغمے
یوں گوارا ہے یہ خونبارِ افق کا منظر
اس کے پرتو میں ہمیں تازہ جہاں ملتے ہیں

ملک حمید

ایک نظم

کوئی بندہ ہے نہ معبود نہ آقا نہ غلام
ایک دستورِ تعین ہے ستاروں کا خرام

آج ذرات کی تابش سے ہر سوچ بھی نکل
آج قصاں ہیں جباہوں پہ بھی خیر کھول

آج ہر شے کیلئے اپنا مقرر ہے مقام
اب عظمت ہے نہ تحقیر نہ دانہ ہے نہ دام

آج خود وقت ہے بجلی کے چھلاؤ کا حر
اب گرہاں نہ سرما، نہ ربیع اور نہ خریف

وہی دستور کہن اور وہی فرسودہ نظام

آج انسان کا بہرہ پ نہیں ہے کوئی
آج انسان ہے خود اپنے مقدر کا خدا
آدمی خود آپ ہے اسے صدر کا جواب
کوئی نقدیر کوئی خالق نقدیر نہیں
آسمان آج پر اسرار نہیں، واہمہ ہے
آج ہے ساغرِ جمشید خود انسان کا شعور

نہیں کچھ بھید گر انما یہ وبے مایہ میں
اب کوئی رفعت پستی کا نخل ہی نہیں

جلد بازی نہیں ہر چند ہماری فطرت
برق کے حلقہ بگوشوں میں ہے ہر اک قسم

ہائے یہ میرا وطن اب بھی یہاں باقی ہے

اہلِ محفل بھی وہی، صاحبِ محفل بھی ہی
رکاب بھی ذہنوں پہ تسلط میں پُرانے اوہام

صبر کا اجر بھی ملتا ہے، یہ مانا۔ لیکن
خود پہ ہر جبر گوارا بھی کریں تو کب تک؟
جس کو آئینہ و شان ہی سے فرصت نہ ملے
ایسے خود ہیں کہ اشارہ بھی کرتے کب تک!

اپنی ہمت ہے کہ بیدار ہیں، بشارت ہیں ہم
سپٹ میں لگ ہے چہروں پہ ہے گردِ آلام
صفت بہ صفت معرکہ آرا ہے ستم ہونا ہے
ساتھیو! ایسے بڑھو گونج اُٹھیں نعمتِ کام

ذوقِ منت کش آدابِ ہیگا کب تک
ساتھیو! آگ بنو، شعلہ کی مانند اُٹھو
ہے ضرورت کہ ہیں سے نیا فراد اُٹھے
سینہ دشت سے جیسے کوئی فریاد اُٹھے

ساتھیو! آؤ، ہمیں کو کہنی کرنا ہے
ہم کو منظور ہے ہنستے ہوئے پی لینے، اگر
جانتے بوجھتے بھی کو کہنی کا انجام
زندگی کیلئے پینا ہی پڑا موت کا جام

ہم رہے لاکھ اسیرانِ غم، بیش و کم
ظلم بھی سہتے رہیں اور پرستش بھی کریں
پھر بھی منصوبہ بندش پہنسی آتی ہے
اس تمنائے پرستش پہنسی آتی ہے

ساتھیو! ہم کو ہمالہ کو اُڑا دینا ہے
اپنے زنداں کی ہے دیوار کہ جو رکے ہے
یہ ہمالہ کہ جو چھوٹا ہے فلک کے دروہام
نئے سورج کی حیات آفرینے نوں کا خرام

ساتھیو! آج بھی سورج پہ لگن ہے کہ جوتھا
عرصہ نیست پہ ہے چھائی ہوئی آج بھی تو
وہ گہن جس کو روایات کہا کرتے ہیں!
وہی ظلمت کہ جسے رات کہا کرتے ہیں!

زندگیوں رنگِ شفق ابھر گیا بالائے افق
مفتی شہر نہ ہو گا، نہ کوئی قبلہ دیں
ہم کو لینا ہے ابھی اک نئے سورج کا سلام
تقدیری بھی ہیں ننگے پہنچے اپنے امام

نئے سرچھان
منبرا

منیب الرحمن

رات ساکت ہے.....

رات ساکت ہے، ستاروں کا سفر جاری ہے
عارض وقت پر ہیبت کا فسوں طاری ہے

سو گئے صدر نشینان دبستانِ جنوں
اپنے سینے سے لگائے ہوئے منشور اپنے
نیم غفلت میں سُنا تا ہے کوئی حالِ نبیوں
کوئی چلا تا ہے خود چھٹیر کے ناسور اپنے

قید خانوں میں ہے ہنگامہ دیر و زوہی
دعوتِ چشم وہی، ساز وہی، سوز وہی

(۲)

شیشہ و جام و سُبُو آج بھی خالی ہی سہی
اور عشرت کی طلب خام خیالی ہی سہی

پھر بھی اسے مُردہ تمناؤں پہ رونے والو!
 دیکھو سینوں میں نیا جذبہ بیداری ہے
 بدلا بدلا سا ہے اندازِ فلک، آگے بڑھو،
 رات ساکت سی تاروں کا سفر جاری ہے
 رگنڈرا اور ہو، پر اب بھی وہی منزل ہے!
 وہی نیلی ہے وہی ناقہ، وہی محمل ہے!

نقوش
 عالمگیر امن نمبر

میراجی غزل

غم کے بھروسے کیا کچھ چھوڑا کیا اب تم سے بیان کریں
 غم بھی راس نہ آیا دل کو اور ہی کچھ سامان کریں
 کرنے اور کہنے کی باتیں کس نے کہیں اور کس سے کہیں
 کرتے کہتے دیکھیں کسی کو ہم بھی کوئی پیمان کریں
 بھلی بُری جیسی بھی گزری ان کے سہارے گزری ہے
 حضرت دل جب ہاتھ بڑھائیں، ہر مشکل آسان کریں
 ایک ٹھکانہ آگے آگے، پیچھے پیچھے مسافر ہے
 چلتے چلتے سانس جو ٹوٹے منزل کا عنوان کریں
 مجبوروں کی مختاروں سے دوری اچھی ہوتی ہے
 مل بیٹھیں، تو مبادا دونوں باہم کچھ احسان کریں
 دستِ مزد میں خشتِ رنگیں اس کا اشارہ کرتی ہے
 ایک ہی نعرہ کافی ہے بربادی ہر ایوان کریں
 میرے تھے میراجی سے، باتوں سے ہم جان گئے
 فیض کا چشمہ جاری ہے حفظان کا بھی دیوان کریں

ن. م. راشد

ایران میں اجنبی

ملاقاتِ اول میں نوروز بولا:

”میں اک کارگر، رنجبر ہوں“

سوادِ کتابی کی لذات سے بے خبر ہوں:

مرا سن ہے پچپن سے اوپر،

مگر میرے بالوں میں اک تارِ خاکستری تک ہویدا نہیں ہے

وہ خوش بخت ہوں،

جس کی دو بیویاں ہیں

جواں سال و رعنا

اور اُن میں، خیابانِ شاپور کی رہنے والی،

مری ہر وہ سالہ زلیخا،

جمیل و جواں تر ہے،

اسفند کی شمعِ رخشندہ گوہرِ ملک سے!

مگر تم یہ باور کرو گے،
کہ ان دو حریفوں کو اک دوسرے کی خبر تک نہیں ہے؟
وہ کہنے لگا:

”تم اگر آج کی شب
زلیخا کے گھر میں

پنیر اور روٹی مرے ساتھ کھاؤ
تو ہم دونوں ممنون و ناشاد ہونگے!“
محبت کی پہلی کرن تھی،

کہ جس نے ہمارے دلوں سے جھلادی تھی یادِ وطن بھی!
تو نوروز بولا:

”مگر ہاں یہ سن لو،
کہ تم نے تمہارے کسی آشنا نے،
جو قربان، میری زلیخا کو فاسد نگاہوں سے دیکھا،
تو یہ نیچے اُس کے ناپاک سینے میں بے شک اتر کر رہے گا!“

تو جب صبح فردا

ابھی ہم خمارِ شبِ رفتہ سے سرگراں تھے،
 ابھی تک دماغوں پہ چھایا ہوا اتحادِ حواں سا،
 ابھی تک نگاہوں میں
 حُسنِ دمیے و رقص و نغمہ کے بکھرے ہوئے تار
 قالین سے بُن رہے تھے،
 اور اک خواہگوں تیرگی میں،
 کبھی ایک دو، اور کبھی سینکڑوں آتشیں جام
 ہنستے تھے، گاتے تھے، اور دور میں گھوم کرناچتے تھے،
 وہ ہر بار جب سامنے سے گزرتے تھے،
 اُن میں سے تیروناں سر نکالے ہوئے جھانکتے تھے !
 کہ جیسے ہماری ہی جانب بڑھیں گے،
 ہمارے ہی دہشت سے بے انتہا سرد جسموں کو
 بس چیر جائیں گے اک عالمِ بے بسی میں !

کبھی اپنی دیرینہ محرمیاں
 اور کبھی قید و بندِ عمل سے وہ تازہ رہائی

سمجھاتی تھی سرگوشیوں میں:

”یہ دیوانہ گرات ہو

اور پھر بھی نہ ہو دشمنہ جانتاں تک گوارا؟“

تصور دکھاتا تھا، لیکن،

مرے ساتھیوں میں سے اک مردِ میداں،

کہ جس نے کسی ساعدِ نور کو چھو لیا ہے،

دھڑم سے گرا ہے،

اور اُس کا لباسِ کمبودی

ہے سب خوں میں لتھڑا ہوا، پارہ پارہ!

تو نوروز آیا، ہنسا اور کہنے لگا:

”تم بڑے سنگدل ہو،

تمہارا وہ ساتھی تو کل شب وہیں سو گیا تھا،

بہت اسکی دلجوئی کرتی رہی میری گلہ و غزالہ،

کہ وہ اپنی مجبور بیوی کی تصویر کو،

سامنے رکھ کے آنسو بہاتا رہا

تہیں کیا مصیبت پڑی تھی
 جو تم نیم شب لوٹ آئے تھے
 منزل کی آسودگی چھوڑ کر،
 ہو کے عالم میں،
 جب کوئے روزن میں
 آوازِ سگ تھی، نہ آدائے درباں؟

وہ مہجور بیوی کی تصویر ———
 وہ ایک گلر و غزالہ کی دلجوئیاں ———
 وہ مرے نیم شب لوٹ آنے کا ارماں ———
 تو، اس پر رہی سب کے دل میں یہ الجھن
 کہ ساتھی کے ”شہکار“ کا راز جانیں!

جاوید
 خاص بزر

افسانے، خاکے

۱۔ ابراہیم جلیس
پرکاش پنڈت
شوکت صدیقی
عصمت چغتائی
فکر تونسوی
کرشن چندر
کنھیا لال کپور
مہندر ناتھ
ہنس راج دہبر

ابراہیم جلیس

جانور

رکھل آدمی رات کو مولوی فتح علی گول باغ میں ایک عورت کیساتھ پکڑے گئے۔
 ہر شخص یہی کہہ رہا، اور پوچھ رہا تھا کہ کیا یہ سچ ہے۔؟ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا میں
 گویا سچ اور جھوٹ کے درمیان کھڑا تھا کبھی خیال ہوتا اتنے لوگ جھوٹ نہیں بول سکتے کبھی
 سوچتا، آدمی اندر کچھ اور ہوتا ہے اور اوپر کچھ اور، جو آدمی خوں کے اندر ہوتا ہے وہ بالعموم
 اس آدمی سے بالکل مختلف ہوتا ہے جو ہماری نظروں کے سامنے ہوتا ہے۔ اب یہ مولوی
 فتح علی — جن کے ماتھے پر داغِ سجدہ ہے۔ ایک بالشت گدگا جمنی ڈارٹھی ہے۔ محلہ
 پرانی انارکلی کے معزز اور معتبر آدمی کہ محلے والے اپنے بھگڑے ٹنٹے پولیس تھانے میں طے
 کرنے کے بجائے انہیں کے پاس چکایا کرتے تھے۔ پیش امام کی غیر حاضری میں ان کے پیچھے
 نماز ادا کرتے تھے۔ اور تو اور گھر میں ایک نیک بیوی، دو جوان لڑکے، اور تین بالغ
 لڑکیاں بھی موجود تھیں۔ اس کے بعد مولوی فتح علی کی یہ شرمناک حرکت —! پھر یہ
 کہ ان کی عمر کیا ایسے افعال کے لئے سوزوں تھی۔ پنتالیس، پچاس کے لگ بھگ ہو رہے
 تھے۔ قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں اور لبِ گور بھی عورت ہے — الہی توبہ!
 بات سارے محلے میں پھیل گئی تھی بات — باتیں بن گئی تھیں۔ لوگ سن رہے

تھے۔ حیران ہوئے تھے۔ سُن رہے تھے۔ مجھے یقین ہی نہ آتا تھا۔ مگر آج مولوی فتح علی وہ بھر دفتر نہ آئے تو یقین میں اور مجھ میں بہت تھوڑا سا فاصلہ رہ گیا تھا۔ دفتر کے دوسرے کلرک سامعی کہہ رہے تھے۔ "اگر یہ بات جھوٹ ہے تو وہ یوں منہ چھپائے کیوں بیٹھ رہے۔؟" ضرور کوئی بات ہے۔ ایک کلرک نے توچکے سے سپرنٹنڈنٹ کو ان کی جگہ اپنی ترقی کے لئے درخواست بھی دیدی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اب وہ کبھی دفتر نہ آئیں گے ایسے شرمناک واقع کے بعد ان کے پاس دفتر آنے کی کیا صورت رہ گئی تھی۔

دفتر میں مولوی فتح علی کی واقعی بڑی عزت تھی۔ ہم سب سینیئر کلرک تھے۔ کام کے اتنے محنتی کے صبح سات بجے دفتر آتے اور شام کے آٹھ بجے دفتر سے نکلتے۔ ڈرافٹ تو اتنے اچھے لکھتے کہ انگریز افسر تک ان کے ڈرافٹ سے ایک لفظ نہ کاٹتا۔ بس چپ چاپ دستخط کر دیتا تھا۔ تنخواہ نہ زیادہ تھی نہ کم۔ لیکن ہنگامی اور بد حالی کے اس زمانے میں جبکہ ہر کلرک کے خوابوں میں رشوت کے روپوں کے چمکیلے ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ مولوی فتح علی نے جائز تنخواہ کے روپوں کے اوپر رشوت کا ایک روپیہ بھی نہیں کمایا۔ اہل معاملہ ان کی مہمندی چمکانا چاہتے تو وہ مسکرا کر انہیں اپنی مہمندی کی لکیریں دکھاتے۔ ہاتھ میں قینچی ہے روپیہ تو میرے ہاتھ میں ہے ہی نہیں۔ آپ کا کام تو اللہ پورا کر دے گا۔

اس کے بعد وہ خود ہی اس کا کام کر دیتے تھے۔

اس طرح ان کی شہرت پُرانی انارکلی کے علاوہ اس لاہور میں بھی پھیل گئی تھی جو ڈپٹی کمشنر آفس کے ارد گرد پھیلا ہوا تھا۔

مگر یہی مولوی فتح علی کل آدمی رات کو گول باغ میں ایک عورت کے ساتھ..... دفتر سے گھر جاتے ہوئے راستے میں پاکستان ٹیلی سال کے پاس مجھے غلام محمد ملا جس نے

اپنی بڑی بڑی خوفناک ہونچھوں میں بل دیتے ہوئے پورے غنڈے پن کے ساتھ ایک آنکھ مار کر مجھ سے پوچھا ۔

”سناؤ جی ۔ بابو جی ۔ آپ کے دوست مولوی فتح علی کہاں ہیں ؟“

قبل اس کے کہ میں اس سے کچھ پوچھوں یا جواب دوں اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا جیسے اس کے سوال کا جواب ایک ایسا ہی بھرپور قہقہہ ہو سکتا ہے ۔

میں نے اسے روک کر کچھ بات کرنی چاہی مگر اس کے ساتھ کوئی آوارہ عورت تھی جسے وہ سائیکل پر سامنے کے ڈنڈے پر بٹھا کر سوار ہو گیا اور فرار ہو گیا ۔

غلام محمد کی اس حرکت کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ مولوی فتح علی اس شرمناک حرکت کا غلام محمد سے بھی یقیناً گہرا تعلق ہے کیونکہ غلام محمد ، مولوی کا ہمسایہ تھا اور یہ ہمسائیگی بہت پرانی تھی ۔ پاکستان بننے یا لاہور آنے سے پہلے جب مولوی فتح علی دہلی میں پھانسی بخش خاں میں بستے تھے تب بھی غلام محمد ان کا ہمسایہ تھا ۔ فسادات کے زمانے میں جب دہلی ٹپٹنے لگی ، جلنے لگی ، مرنے لگی ۔ اس وقت یہ خبر کسی نے مشہور کر دی تھی کہ وہ سبزی منڈی کے بلوے میں مارا گیا ۔ مولوی فتح علی اس کی بیوی اور بچے کو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ ہالوں کے مقبرے والے پناہ گزیں کیمپ میں لے آئے بڑی ڈھارس دی ۔ عمر بھر کفالت کا ذمہ لیا ۔ مگر ہالوں کے مقبرے پہنچ کر انھوں نے بڑی حیرت سے دیکھا کہ غلام محمد زندہ ہے اور مقبرے کی سیڑھیوں پر بیٹھا اپنے بیوی بچوں کیلئے زار و قطار رو رہا ہے ۔ مولوی فتح علی اور اپنی بیوی اور بچے کو دیکھا تو ان کے پیروں پر گر گیا ۔ وہ غنڈہ جو پھانسی بخش خاں کے علاوہ دہلی کے دوسرے محلوں میں بھی بد معاشری اور غنڈہ گردی میں مہر و مانا جاتا تھا جس نے پولیس کے آگے کبھی سر نہ جھکا یا تھا مولوی کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بندہ بے دام ہو گیا ۔ پھر دونوں اکٹھے ہاجرین کے

آخری قلعے کے ساتھ لاہور پہنچے اور یہاں آکر غلام محمد نے ایک کے بجائے دو مکانوں پر قبضہ کیا بڑے مکان پر تو خود قابض ہو گیا اور چھوٹا مکان مولوی فتح علی کو دیدیا۔

لیکن لاہور آکر دونوں کے تعلقات آہستہ آہستہ خراب ہوتے گئے۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ دونوں ہمراہ تھے۔ اور لڑائی شرط ہمسائیگی ہے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ مولوی فتح علی مسجد تھے اور غلام محمد خرابات۔ غلام محمد نے یہاں آکر بھی وہی غنڈہ پن شروع کر دیا جس کی بدولت وہ دہلی میں ایک باجیل بھی جا چکا تھا۔ مولوی فتح علی اس کو ہمیشہ سمجھاتے، مناتے نصیحتیں کرتے، ڈانٹتے، پیار کرتے۔ غلام محمد ان کا تھوڑا بہت احترام تو کرتا تھا لیکن ایک بار تو اس نے احسان فراموشی کی انتہا کر دی۔

ایک بار رمضان شریف کی رات تھی مولوی فتح علی تراویح پڑھ کر آدھی رات کو گھر لوٹ رہے تھے کہ گول باغ کے قریب ایک عورت کے چھینے اور چلانے کی آوازیں آئیں مولوی فتح علی دوڑے دوڑے اس کی طرف گئے تو دیکھا کہ غلام محمد اس کے تین چار ساتھی ایک چودہ پندرہ برس کی لڑکی کو گھرے کھڑے ہیں۔ لڑکی نے جونہی مولوی کو دیکھا دوڑ کر ان سے لپٹ گئی اور چھینے لگی۔ ”جھے بچاؤ۔ خدا کے لئے ان غنڈوں سے بچاؤ۔ خدا کے لئے ان غنڈوں سے بچاؤ۔“

غلام محمد مولوی کا سارا احترام دل سے نکال پھینک کر غرایا۔

”مولوی جی۔ ادھر کیا نماز پڑھنے آئے ہو۔ یہ باغ ہے مسجد نہیں ہے۔ چھوڑ دو، اس

لڑکی کو یہ ہماری ہے۔“

مولوی فتح علی نے غلام محمد کو خوب ڈانٹا، پھٹکا مگر اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے

جیسے ایک چاقو نکالا۔ مگر اسی اثنائیں ماؤن ہال کی طرف سے آتی ہوئی ایک کار کی روشنی

اندھیرے میں پھیل گئی۔ غلام محمد اور دوسرے غنڈے بھاگ کھڑے ہوئے۔ کاربھی ہی قریب آئی مولوی نے آواز دے کر روک لی۔ کار میں کوئی رومانوی مزاج جوڑا بیٹھا تھا مولوی نے سارا واقعہ سنایا اور اسی کار میں اس لڑکی کو بٹھا کر اس کے گھر چھوڑ آئے۔

دوسرے دن صبح اسی بات پر مولوی فتح علی سے غلام محمد جھگڑ پڑا کہ انھوں نے شیر کے سامنے سے گوشت ہٹا لیا تھا۔ مگر مولوی فتح علی کہتے تھے کہ انھوں نے اس لڑکی کو نہیں بچا یا ہے بلکہ غلام محمد کی بیوی اونچے کو دوسری بار بچا لیا ہے۔

اس واقعہ کے بعد سے مولوی فتح علی اور غلام محمد میں بڑے زوروں کی ٹھن گئی تھی اور وہ مولوی سے بدلہ لینے کی خاطر ان کے خلاف بڑی بے سروپا، غلیظ اور داہیاتانہاں ہیں اڑانے لگا تھا۔ میں نے سمجھا کہ کل رات کو مولوی صاحب کا کسی عورت کے ساتھ پکڑا جانا بھی ایک ایسا ہی واقعہ ہے جو گول باغ میں پیش آنے کے بجائے دراصل غلام محمد کے گندہ ذہن میں رونا ہوا ہے میں غلام محمد کے اس گول باغ والے واقعہ سے بخوبی واقف تھا اسی لئے مجھے یقین ہو گیا کہ غلام محمد نے مولوی فتح علی کو ذلیل کرنے کے لئے یہ آخر حربہ استعمال کیا ہے اور اپنی زندگی کی اس اندھیری اور فحش رات کو زیر دستی مولوی فتح علی کی زندگی میں داخل کر دیا ہے۔ اور اس رات کے منظر میں اپنی جگہ پر مولوی فتح علی کو کھڑا کیا ہے۔

اب مجھے کچھ اطمینان سا محسوس ہوا۔ میں نے اپنے گھر جانے کے بجائے پہلے مولوی فتح علی کے گھر جانا مناسب سمجھا۔ کیونکہ میرے دل سے غلط فہمی بڑی حد تک دور ہو گئی تھی۔ اور اب ان سے ملنے میں نہ مجھے کوئی عار تھا اور نہ ان کے شرٹنے کا کوئی امکان تھا۔ راستے میں "اودنگ زیب" ہوٹل کے پاس مجھے عبدالرشید طاہر جو میرا دوست فتح علی کا مشترکہ

اور گہرا دوست تھا۔ ہم تینوں ہر شام اورنگ زیب ہوٹل میں بیٹھے ریڈیو پر رات کی خبریں سننے اخبارات پڑھتے چائے پیتے اور گپیں ہانکتے تھے۔ عبدالرشید آج خلاف معمول شام سے پہلے ہی ہوٹل میں داخل ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر آواز دی۔

”اوہ۔۔۔ آؤ آؤ۔۔۔ تمہیں ایک بڑی حیرتناک خبر سناؤں۔“

اندر جا کر اس نے چائے کا آرڈر دیا۔ اور ادھر ادھر دیکھ کر بڑے آزادانہ لہجہ میں بولا۔

”کیا بتاؤں یار۔۔۔ اپنے مولوی نے تو رات لٹیا ہی ڈبو دی۔ تم نے سنا رات مولوی.....“

میں نے کہا۔

”ہاں میں نے سنا ہے۔ مگر میرا خیال ہے یہ بھوٹ ہے۔ اس میں مجھے غلام محمد کی کوئی ناپاک سازش معلوم ہوتی ہے؟“
عبدالرشید نے کہا۔

”نہیں یار کسی کی سازش نہیں۔ مجھے ابھی عید د ملا تھا جو یہاں کے تھانے کا سپاہی ہے اس نے مجھے بتایا کہ اسی نے کل رات مولوی کو ایک عورت کے ساتھ پکڑا ہے۔ مولوی اور وہ عورت رات بھر عورات میں رہے۔“

میں نے پوچھا۔

”وہ عورت کون تھی؟“

رشید نے جواب دیا پتہ نہیں کون تھی۔ بہر حال جو بھی تھی بڑی آوارہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک پتائیس سچاس کے بوڑھے کے ساتھ چلی گئی ہے۔

وہ خاموش چلتا رہا۔ ہم دونوں مولوی کے گھر پہنچے۔ دستک دی۔ ڈاکٹر اندر تھا
راشد باہر نکلا اور بولا "ٹھہریے۔ ابھی اباجی کو بھیجتا ہوں۔"

ہم دونوں کو باہر سڑک پر ہی ٹھیرنا پڑا۔ کیونکہ مولوی کے گھر کوئی بیٹھک ہی نہیں
تھی۔ صرف دو کمرہ لکھڑا تھا۔ اسی لئے مولوی نے اوزنگ زیب ہوٹل کو اپنا ڈرائنگ دم
دیوان خانہ، بیٹھک سمی کچھ بنایا ہوا تھا۔

بڑی دیر تک مولوی باہر نہ آیا۔ جب ڈاکٹر باہر نکلا تو ہم نے ڈاکٹر سے پوچھا کہ کیا
بات ہے۔؟ معلوم ہوا کہ مولوی کی بیوی نے خودکشی کی خاطر ڈیڑھ تولہ انیون کھائی تھی
رفیع پھر ڈاکٹر کے ساتھ غالباً دوائی لینے چلا گیا۔

ہیں یقین ہو گیا کہ مولوی نے سچ مچ مولویوں کی دیرینہ روایات کو برقرار رکھا ہے۔ وہ
اب ہم سے ملنا نہیں چاہتا۔ ہم واپس جانے ہی والے تھے کہ اچانک سیری نظردروازے
پر پڑی جو ذرا سا کھلا ہوا تھا۔ اور جس میں سے مولوی چور کی طرح جھانک رہا تھا۔ میں
نے اسے پہچان لیا۔ اور قریب جا کر کہا۔

"مولوی دروازہ کھولو۔ چھپنے سے کیا فائدہ۔ ہم تمھارے بے تکلف اور ہمدرد
دوست ہیں اگر تمھیں اب بھی ہماری مدد کی ضرورت ہے تو ہم تیار ہیں۔ ہم اسی لئے تمھارے
پاس آئے ہیں۔"

مولوی نے دروازہ کھول دیا۔ ہم اندر داخل ہوئے وہ کمرہ نہیں تھا، بلکہ بادچی خانہ
غلیانہ، کباڑ خانہ سمی کچھ تھا جس میں ایک طرف چوٹھا تھا۔ دوسری طرف ٹلاکھا ٹنک
رکھے تھے۔ جھوٹے برتن پانی کی باٹی کے پاس پڑے تھے۔ مولوی نے ہمیں ٹرنکوں پر
بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور خود میلے کپڑوں کی بڑی سی گھٹری پہ بیٹھ گیا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا

مرجھایا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر تمینوں غاموش ہے۔ اس کے بعد میں نے پوچھا۔

”کیوں بھیجی۔ بھابی اب خطرے سے باہر میں نا۔“

مولوی نے بھی سوئی آواز میں جواب دیا۔

”ہاں — بچ گئی۔“

رشید نے پوچھا — ”کیوں بھیجی۔ یہ بات کیا ہوئی تھی۔؟“

میں نے غصے سے رشید کی طرف دیکھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ رشید اس وقت کوئی ایسا بات پوچھے جس کا تعلق کل رات والے واقع سے ہو۔

مولوی نے رشید کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف — اور پھر یکبارگی تیز اور غصہ آمیز لہجے میں بولنے لگا۔

”تم میرا گھر دیکھتے ہو۔ ایک بڑے مکان کے لئے کوئی پندرہ بیس درخواستیں مے چکا ہوں۔ کچھ نہیں ہوتا۔ یہ — یہی دو کمرے۔ بلکہ ایک ہی — یہ — یہ کمرہ ہو؟ اسے کمرہ کہا جاسکتا ہے؟“

وہ ہم دونوں کی طرف دیکھ کر گھورنے لگا جیسے جواب چاہتا ہو۔ جیسے اسے معلوم ہے کہ ہم کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ جیسے ہم اس سے مخاطب نہیں۔ جیسے ہم اس کے روزانہ ملنے والے دوست نہیں۔ بلکہ محکمہ آباد کاری کے افسر ہیں۔

اس نے پھر کہنا شروع کیا۔

”مجھے پاکستان آئے دو سال ہو گئے ہیں دو سال سے میں اپنی بیوی دو جوان لڑکوں اور تین بالغ لڑکیوں کے ساتھ اسی کمرے میں قید ہوں۔ بتاؤ — میں کب تک قید ہوں میں بھی انسان ہوں، میں پاگل ہو جاؤں گا۔ جاؤ، مجھے اسی قید میں گھٹ کر مر جانے دو

یہاں سے چلے جاؤ۔ جاؤ۔

اور وہ خود ہی اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اندر سے اس کی بیوی کے کمرے کی آواز آرہی تھی۔ ہم دو تین لمحے وہیں بیٹھے رہے۔ اور اٹھ کر باہر چلے گئے۔

راستہ بھر رشید بالکل خاموش رہا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا کہ کیا بات کی جائے ہم بھراؤ رنگ ریب ہوٹل میں گئے۔ وہاں محلے کا تھا نیدار خان ریاض محمد بھی بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ اس نے ہمیں دیکھ کر چائے پینے کی دعوت دی۔ ہم اس کی مینر پر بیٹھ گئے۔ تو اس نے پیالی سے چائے طشتری میں انڈیلی۔ دد گھونٹ پئے۔ اور چائے میں بھیگی ہوئی اپنی بڑی بڑی سونچوں کو دمال سے صاف کرتے ہوئے بولا۔

”یار رشید۔ وہ تمہارا دوست مولوی فتح علی بھی عجیب آدمی نکلا۔ اپنی بیوی کو سیر کرانے آدھی رات کو گول باغ چلا آیا۔ لاحول دلاقوۃ۔ ایسے کاموں کے لئے گھر میں کوئی جگہ نہیں تھی.....“

رشید اور میں نے یکجہت ایک آواز ہو کر حیرت سے پوچھا۔

”کیا۔ کیا وہ اس کی بیوی تھی۔؟“

تھانیدار اپنی رو میں بولے چلا جا رہا تھا۔

”توبہ، توبہ۔ انسان جانور سے بھی بدتر ہو گیا ہے۔ اتنی لمبی لمبی ڈاڑھیوں

والوں کو بھی پاکستان کی عزت کا کوئی خیال نہیں۔ تو پھر پاکستان کلکیا حشر ہو گا۔؟

— کیوں جی؟“

مگر ہم دونوں آباد کاری کے افسروں کی طرح خاموش چپ چاپ بت بنے

بیٹھے تھے۔

پرکاش پنڈت

مفلوج

منز گوتم کی کڑی نگرانی کے باوجود انڈوں کی بھر جی بھر بھری بننے کی بجائے بھلس گئی تھی اور آلوؤں کی ٹکیوں میں تو مصالحہ اس قدر چھوڑا ہوا تھا کہ پہلے ہی پیگ پر سٹراے۔ وی نزد تم داس گوتم نے زور زور سے چلاتا شروع کر دیا۔ بلاؤ سوڑ کے پتھے کو۔ آلو کے پٹھے کو ذرا بلاؤ۔“

لیکن منز گوتم نے سوڑ کے پتھے یا آلو کے پٹھے کو بلانے کی بجائے آلو کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے پچکارنے کے سے لہجے میں کہا ”کہاں ڈار لنگ! نوکروں کو ہر دقت نہیں کو سا کرتے۔“

مگر سٹر گوتم اس وقت کسی قسم کی نصیحت سننے کے موڈ میں نہ تھے اور منز گوتم پر واضح تھا کہ جب وہ اس قسم کے موڈ میں نہیں ہوتے تو کیا کچھ ہوا کرتا تھا۔ نوکروں کے بعد سٹر گوتم کا تمام تر ترلہ انہی کی ذات پر آن گرتا تھا۔ اگرچہ اسے تہذیب یافتہ ہونسی صحت کے مظاہرے کی خاطر وہ انہیں ہمیشہ ڈیر یا ڈار لنگ کے خطاب کے ساتھ ہی مخاطب کرتے تھے۔ مگر موٹی موٹی گالیاں دینے میں بھی کم فراخ دلی کا ثبوت نہ دیتے

تھے۔ چنانچہ دبے گئے سے وہ خود بھی نوکروں کی نالائقی، کام چوری اور نمک حرامی کا اقرار کرنے لگ جابا کرتی تھیں۔

”ہماتے تو ہو ڈیر۔ الماری میں سے مچھلی کاٹین نکالنے کے لئے اٹھتی ہوئیں مسرگو تم نے مسرگو تم کے کندھوں پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا: ”آج کل نوکروں کا کتنا توڑا ہے“ اور اس سے پیشتر کہ مسرگو تم نوکروں کے توڑے کی بات پر ہی اناب شاپ بکن شروع کر دیں وہ مچھلی کے ٹین کو کھلوانے کے بہانے کچن کی طرف نکل گئیں۔

اچانک ہاتھ آگئے والے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مسرگو تم نے جلدی جلدی ایک بڑا سا پیگ بھرا اور غٹا غٹ پی گئے۔ پھر سگریٹ سلگا کر صوفے کی پشت پر اپنی پشت گرا دی اور دھواں پینے لگے۔ چوری کے اس پیگ کو بھرنے اور حلق میں انڈیلنے کے لئے جتنی پھرتی سے انھوں نے کام لیا اتنی ہی تیزی کے ساتھ اُن کا تمام غم و غصہ ایک ساتھ دھل گیا۔ اپنے آپ کو ہلکا اور سبک محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ بیوی کی بیوقوفی پر انھیں ہنسی آگئی۔

ادھر کچھ مہینوں سے کہ جب سے ان کے کندھے کپتانی کے تین پھولوں کی بجائے میجر کی چمکے ارکراؤن سے مرصع ہو گئے تھے مسرگو تم کو امن کی گرتی ہوئی صحت کا ایک لخت الہام ہو گیا تھا۔ انھیں وقت پر سنانے، وقت پر جگانے، وقت پر ناشتہ، لچ اور ڈنر کرانے کے انتہام کے علاوہ ان کی روزمرہ کی شراب نوشی پر پابندی عائد کر کے اس مقصد کے لئے مہینے میں دو دن مقرر کر دیئے تھے۔ بدھ اور سینچر۔ اور بدھ اور سینچر کے روز بھی وہ انھیں چوتھے پیگ سے تجاوز نہ کرنے دیتی تھیں۔ شروع شروع میں مسرگو تم اس نادر شاہی حکم پر بہت سیخ پا ہوئے۔ پچھلے آٹھ

برس سے وہ بلاناغہ شراب پینے کے عادی تھے اور ان کے کہنے کے بموجب ایک شراب
 ہی کی بدولت چالیس برس کی عمر میں بھی ان کا رنگ کشمیری سیب کی طرح سُرخ تھا
 اور ان کے قدم بڑھاپے کی طرف اٹھنے کے بجائے اُلٹے پڑ رہے تھے۔ مگر ان کا تمام
 پیٹنا نابیکار ثابت ہوا۔ مسز گوتم کے سامنے انھیں ہتھیار ڈالتے ہی بنی۔ یہ بات الگ تھی
 کہ اب اگر ہر روز نہیں تو ہر دوسرے دن کوئی دوست، کوئی افسر کہ جس کے آگے وہ
 انکار نہ کر سکتے تھے انھیں مدعو کر لیتا تھا یا کلب اور میس کی محفلوں ہی میں انھیں مجبوراً
 ایک دو پیگ اٹھانے پڑ جاتے تھے۔

مسز گوتم جس وقت طشتری میں مچھلی کے ٹکڑے رکھے واپس لوٹیں اور مسز گوتم
 کو صوفے پر اس نیم درازہ حالت میں پڑے دیکھا تو انھیں ترس آگیا۔ ”ڈارلنگ! بس یہی
 کھوٹ ہے تم میں۔“ طشتری کو میز پر ٹکلاتے ہوئے وہ ان کی بغل میں بیٹھ گئیں۔ ”کیوں اپنی
 شام خراب کرتے ہو؟“

اور مسز گوتم کا چہرہ ایک پچھٹے کے ساتھ پھر دھک اٹھا اور پیسے ہی پڑے وہ
 غراے ”نہیں تم ہی مجھے مارنے پرتلی ہوئی ہو ڈارلنگ۔ تم ہی۔ تم ہی نے دیر۔ ان لوگوں کے
 پٹھوں کی کیا مجال ہے؟“

ایک ادا کے ساتھ اپنے بھاری بھر کم جسم کو سمیٹ کر گلاس میں دسکی اندھیلے ہوئے
 مسز گوتم نے اپنے تجربے کے تمام دانتوں اور مسوڑھوں کی نمائش کر دی۔ ”میری خاطر
 ڈارلنگ! تمہیں میرے سر کی قسم“ اور اپنا بازو ان کی گردن کے پیچھے ڈال دیا۔

اور مسز گوتم کو بیوی کی حرکتوں سے گھن آنے لگی، انہوں نے بیدلی کے ساتھ
 چپ چاپ اس کے ہاتھ سے گلاس لے لیا اور آہستہ آہستہ سب کرنے لگے۔

بیوی کی اس قسم کی حرکتوں سے انھیں ہمیشہ ہی سے نفرت تھی اور وہ شروع زمانے ہی سے اسے ایک حد تک اپنے ناقابل سمجھے آ رہے تھے۔ فوج میں بھرتی ہونے سے قبل بھی جب ان کی شادی نئی نئی ہوئی تھی اور وہ بی۔ اے کر چکنے کے بعد متواتر تین برس سے بیکار پھر رہے تھے انھیں مسز گوتم، مسز گوتم کہلانے کی مسرت دکھائی نہ دیتی تھیں مسز گوتم کا وہ تحکمانہ لہجہ۔ ہر بات میں اڑی اور ہر وقت اپنے ماں باپ کے ہی گن گاتے رہنا۔ مسز گوتم کو ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ جس بات سے انھیں چڑھتی وہ بیوی کے بیجا غمزے تھے کہ بھینس کی بھینس ہونے کے باوجود وہ خود کو دنیا کی حسین ترین عورتوں میں شمار کرتی تھی۔ اور ہر وقت اپنے چہرے پر دنیا جہان کے غازے اور پوڈر تھوپے رہتی تھی۔ والد مرحوم کی فوجی خدمات اور سر صاحب کی دوڑ دھوپ کے طفیل مسز گوتم سکینڈ لیفٹننٹ ہوتے ہی بٹانگ دہل اعلان کر دیا کہ وہ اس کی ہر جائز و ناجائز بدداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ کر یا کندھے سے کندھا ملا کر اسے سڑکوں یا پارکوں میں گھماتے پھریں اور دنیا تھیسٹر یا کسی دوست کے ہاں لے جائیں اور اگرچہ سکینڈ لیفٹننٹ سے لے کر مسجری تک کے دس برسوں میں ان کے ایسی تعلقات کئی مرحلے طے کر چکے تھے۔ آج مسز گوتم گھر کی تمام سیاہی سفیدی کی مالک تھیں جسم پہلے سے بھی دو گنا بھدا اور بے منگم ہو جانے پر بھی ڈیر اور ڈارلنگ کہلاتی تھیں غازے اور پوڈر کا استعمال اب اس بے دریغی سے نہ ہوتا تھا اور ان کی اس چرب زبانی اسی ہی طبیعت میں بھی نمایاں فرق آچکا تھا۔ مگر مسز گوتم کا وہ فیصلہ آج تک بغیر کسی تبدیلی کے جوں کا توں چلتا آ رہا تھا۔ البتہ کسی وقت خوشی میں آ کر جب مسز گوتم انھیں ڈیڑھینیں "یا ہاتھی ڈلہ لنگ" کا لقب عنایت کرتے تو پیس بھینس ہونے کی بجائے ان کی دھلکی ہوئی

پھاتوں میں زیر و بم پیدا ہو جاتا اور چار بچے جن چکنے کے سبب قدرتی طور پر بڑے ہوسے پیٹ میں لہریں سی ناچنے لگتیں اور کھٹ سے جڑوں سمیت تپسی نکل آتی۔ تو سترگو تم کو اچانک کلب جانے کسی پارٹی میں شریک ہونے یا دست بردار کام کی زیادتی کی بات یاد آ جاتی۔

سترگو تم نے مچھلی کا ٹکڑا منہ میں ڈالنے سے پہلے پشتری کو اٹھا کر سونگھا تو اس میں سے بو آ رہی تھی۔ مگر اس دفعہ نہ مانے کس خیال کے زیر اثر کچھ نمبے کی بجائے انھوں نے سترگو تم پر اک قرآؤد نگاہ ڈالنے پر ہی اکتفا کیا اور پھر جو گلاس میں وکی انڈیلنے لگے تو انڈیلتے ہی چلے گئے۔

سترگو تم ان کا ہاتھ نہ روک سکیں۔

سترگو تم اکثر ان کا ہاتھ روکتے روکتے رہ جاتی تھیں۔ انکی لاکھ ہلاتوں اور کوششوں کے باوجود سترگو تم کو کسی نہ کسی چیز میں کوئی نہ کوئی نقص نظر آ رہی جاتا تھا اور جب انھیں کوئی نقص نظر آ جاتا تھا تو گاہوں کی گچھا شروع ہو جاتی تھی۔ نوکروں کو گالیاں۔ بیوی اور بچوں کو گالیاں۔ دوستوں، واقف کاروں، ماتحتوں اور افسروں کو گالیاں۔ اور جب گالیاں بک چکنے کے فوراً بعد یا کہیں درمیان ہی میں وہ ایک دم سنجیدگی اختیار کر لیتے تو سترگو تم کو ان کا ہاتھ روکنے کی جرأت نہ ہوتی سترگو تم کی چابہگیوں کی قسم ٹوٹ جاتی۔ پیگ بڑے ہو جلتے اور وہ اس وقت تک برابر پیگ پر پیگ انڈیلتے رہتے جب تک کہ ان کی بوتل دھونے کے لائق نہ رہ جاتی یا انھیں یقین نہ آ چکا کہ انھیں سرورہ آچکا ہے۔ سرورہ آچکنے کے بعد انھیں برہا کے محاذ اور لنکا کی مٹھلیں یاد آنے لگتیں۔ دنوں کچڑ میں دھنسنے پڑے رہنا۔ بارہ بارہ گھٹنے کی لگنا۔ بھڑی سیلاب جو نکلیں اور چھہر اور دشمن کے بڑے دھانے کی توپوں کے دھماکے۔ ہوائی جہازوں کی

مباری اور ہر لمحہ شدید سے شدید تر ہوتی ہوئی۔ زندگی اور موت کی کش مکش۔ اور وہ وقص
 و صرود، ہر رنگ اور ہر نسل کی نازنینوں کے نیم عریاں تھرکتے ہوئے جسم۔ کیتانی کے عہدے کا
 پُر تکنت احساس اور شراب، اور وہ یا تو اپنی دونوں مٹلی میں کار توں بھر کر بنگلے سے باہر نکل جاتے
 اور پُرانے قلعے کی جانب جاتی ہوئی سڑک کے اس طرف مرغیوں کے ڈروں یا نوکروں
 کے کو اڑتوں کی آڑے کر اس پہاڑی گیدڑ کا انتظار شروع کر دیتے جو قریبی جنگل سے
 آکر رات رات بھران کے بنگلے کے ارد گرد دھوم مارتا تھا اور بالکل انسانوں کی سی آوازیں
 نکالتا تھا۔ یا پھر وہ اپنی بے تکی آواز میں "کھٹاں گجاری آرات ڈھولا" کا پوٹھوہاری گیت
 اونچے نیچے سروں میں الاپنے لگتے اور مسرگوتم کو ڈیر بھینس اور ہاتھی ڈارنگ کے خطاب
 کے ساتھ ساتھ اُن کے ایک میجر کی بیوی ہونے اور اس طرح کے شاندار بنگلے میں رہنے پر
 پُر ہیج گالیوں میں تعجب کا اظہار کرتے۔

دلزلی روڈ پر واقع وہ شاندار بنگلہ جس کا پچھلے ملک مشرق کی طرف کھلتا تھا اور جہاں
 سے قریبی جنگل اور پُرانے قلعے کے تسکستہ میناروں کا نظارہ صاف طور پر کیا جاسکتا تھا انہیں
 حال ہی میں حکومت کی طرف سے ملا تھا اس سے پیشتر مسرگوتم فوجی یس میں رہتے تھے اور
 مسرگوتم بچہ اپنے چاروں بچوں اور دونوں نوکروں کے پُرانی ولی کی ایک گنجان آباد گلی
 میں پاکستان بننے سے پیشتر اور جنگ کے دوران میں چونکہ مسرگوتم کو اکثر ملک کے دور دراز
 علاقوں میں رہنا ہوتا تھا مسرگوتم لاہور میں اپنے والدین کے ہاں رہتی تھیں۔ نسبت روڈ
 پر واقع اس چھوٹے سے مکان میں ہر وقت ایک ہنگامہ، ایک طوفان بدتمیزی سا برپا
 رہتا تھا اور مسرگوتم اُن کی حد تک اس ہڑبونگ کی عادی ہو چکی تھیں۔ بچے جمع چلا ہے
 ہیں۔ لیکن نوکروں کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔ کھوٹیوں کے کپڑے، کوٹوں کتروں میں، ٹوٹے ہوئے

ریکٹ اور بے ڈرینگ ٹیبل پر۔ صابن دانیاں اور تیل کی شیشیاں رسوائی گھر میں اور گیلے تیلے اور دانتوں کے برش ڈرائنگ روم میں۔ مگر یہاں آکر ایک دُنیا بدلتی تھی۔ بچوں کو ایک میجر کے بچے اور بیوی کو ایک میجر کی بیوی بننا تھا۔ مالی سے بھنگی اور بھنگی سے خانساں کا کام نہیں لینا تھا اور مسٹر گوتم کو کہ ایک دُنیا دیکھ چکے تھے اور فوجی تربیت کے کارن ہر حرکت، ہر فعل میں سلیقہ اور باقاعدگی دیکھنے کے متمنی تھے۔ گھر میں قدم رکھتے ہی سارا بنگلہ سر ہوا اٹھا لینے کی ضرورت محسوس ہو جاتی اور پھر شراب - - - - -

پیگ کو ہاتھ میں لیکر وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور کھڑکی کا پردہ اٹھا کر باہر تادیکی میں گھورنے لگے۔ جنگل سے آنے والی سرد ہوا کے جھونکوں نے ان کی کپٹیوں کو سہلانا شروع کر دیا اور جلد ہی انھیں احساس ہو گیا کہ ان کا سرور کس ڈگری تک پہنچ چکا ہے۔ ہاتھ کے پیگ کو ختم کر چکنے کے بعد وہ دوبارہ آکر صوفے میں دھنس گئے اور مسٹر گوتم کے کچن میں چکر لگانے کی غرض سے اٹھ جانے کے سبب منہ بگاڑ بگاڑ کر جھلے ہوئے انڈے اور ڈسری بھسی مچھلی نکلنے لگے۔ اچانک انھیں پچھلے اتوار کو مسٹر بھار دواج کے ہاں کھائے ہوئے انڈوں کے حلوے کی یاد آ گئی۔

مسٹر بھار دواج ان کے ماتحت کیپٹن رلیارام بھار دواج کی بیوی تھیں وہ جب سے دلی میں تعینات ہوئے تھے اور جب سے مسٹر بھار دواج کو ان کی شراب پرستی، ان کی بنگیلی طبیعت کا علم ہوا تھا وہ لوگ ہر اتوار کو اپنے ہاں ہونے والی سندے شنگ میں انھیں ضرور مدعو کرتے تھے۔ محفل میں مسٹر اور مسز بھار دواج کی دونوں فوجانہ لڑکیوں کے علاوہ..... دوسری اعلیٰ گھرانوں کی عورتیں بھی شریک ہوتی تھیں۔ وہاں کسی قسم کے تکلف کی گنجائش نہ تھی۔ دوستوں کی طرح اکٹھے بل بیٹھنا، ہنسی مذاق کھانا پینا ہوتا تھا

سیر و تفریح کے پروگرام بنتے تھے اور سارا دن ہنستے کھیلتے گزر جاتا تھا اور یہ ان منٹے پادشہوں ہی کا صدقہ تھا کہ مسٹر گوتم کو میس کی آزادانہ زندگی ہنستے میں ایک آدھ بار ہی یاد آتی تھی مسٹر گوتم سے بارہا وہ لوگ مسٹر گوتم کو ہرا د لانے کے لئے کہہ چکے تھے مگر وہ ہر بار ٹال مٹول کر جاتے۔ کوئی بہانہ تراشتے وقت انھیں کتنی کوفت ہوتی تھی۔ نازک اندام اور ہنس مکھ نانہ منوں کے درمیان ایک بھاری بھر کم جسم کی بد شکل اور بے ہنگم اور معفوں کے آداب سے قطعاً بے بہرہ عورت کے تصور ہی سے ان کا دل کباب ہو جاتا۔ رمی یا برج کھیلتے وقت جب دستور کے مطابق اپنی بیوی کو مخالفت سمت میں بٹھانے کی بات اٹھتی اور مسٹر بھار دواج کی دونوں نوجوان اول جلی لڑکیاں ان کے گھٹنوں پر بیٹھ کر اور ان کی گردن میں بازو حائل کر کے مسٹر گوتم مسٹر گوتم کا شور مچانے لگتیں تو فطر برج سے یہ ڈوبے جاتے اور کھیلنا، بات کرنا ایک بار ہو جاتا اور وہ رات نوکروں اور بچوں اور مسٹر گوتم کی شامت کی رات ہوتی۔

بیوی کی بد صورتی کو تو وہ کسی طرح نظر انداز کر سکتے تھے بلکہ اُس کی بد صورتی کی اولی کر تو لوگوں کی نگاہوں میں وہ خود کو زیادہ قابلِ رحم انسان منوا سکتے۔ تھے مگر اپنے دہجے کے لوگوں میں اُٹھنے بیٹھنے کی صلاحیت کا جو اس میں فقدان تھا اسے کسی صورت بھی قابلِ معافی نہ سمجھا جاسکتا تھا اگر ایک بار بھی اُسے اس قسم کی کسی مغل میں شریک کر لیا گیا مسٹر گوتم کا خیال تھا کہ وہ برسوں سے چلے آ رہے کسی بیکار خاوند کی بیوی ہونے ہی کے اہل تھی، تو انھیں عمر بھر پچھتا نا پڑے گا۔ اتنی سی بات پر ہی وہ ان کے بیگانہ عورتوں کے ساتھ ناجائز راہ و رسم کا ڈھنڈورہ پیٹ دیگی اور کچھ تعجب نہیں جو اپنا سر بھی پیٹ لے۔ اس کے سر پیٹ لینے کا تو انھیں تلخ تجربہ بھی ہو چکا تھا۔ ان دنوں وہ سیلون سے پھٹی پر آئے تھے

اور انہوں نے سبیل تذکرہ اپنی دہاں کی زندگی کے متعلق صرف اتنا کہہ دیا تھا کہ اگر انھیں چٹوں سیلاؤں وغیرہ میں جانے کی اجازت نہ ہوتی اور نہ ہی میڈم لوئی ایسی مہماں نواز عورت سے اُن کا واسطہ پڑتا تو بھلے چنگے آدمی کو بیمار اور کمزور کر دینے والی دہاں کی آب و ہوا اور خوراک اُن کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیتی۔ میڈم لوئی سے ان کا صرف اتنا ہی تعلق تھا کہ وہ انھیں اپنے مرحوم خاوند میجر لوئی کی باتیں، اس کے کارنامے بڑے چاؤ سے سنایا کرتی تھی۔ اور انھیں وقت بے وقت اپنے گھر آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ اپنے کمسن لڑکے سے وہ انھیں فوجی سلام کرواتی۔ انھیں فلاں چیز کافی مقدار میں کھائیے، فلاں کو سونگھنے تک کی کوشش نہ کیجیے وغیرہ ہدایات دیا کرتی تھی۔ اور کبھی کبھار شاپنگ یا چہل قدمی کرنے ان کے ساتھ سکل جاتی تھی مگر مسز گوتم پر کچھ یہ حقیقت نزول ہو گئی کہ میڈم لوئی کے ساتھ ان کے میاں بیوی کے تعلقات تامل ہو چکے ہیں۔ سامری جہنٹ اس بات کی شاہد ہے اور یہ کہ کچھ ہی دنوں بعد وہ بدکار عورت ان کا نام کٹوا کر انھیں لندن لے آئی گی اور اس بات پر خاندان بھر میں، وہ لے دے ہوئی کہ چٹیاں ختم ہونے سے قبل ہی انہوں نے واپسی کا ٹکٹ کٹوا لیا اور لگاتار دو مہینے تک سر صاحب کی طرف سے ہر تیسرے چھتے آدھمکنے والے خط کو بغیر پڑھے ہی پھاڑتے رہے۔

مسز گوتم ابھی تک کچن سے واپس نہ لوٹی تھیں اور ساتھ کے بیڈنگ روم میں ننھے بچے نے چنچیا چلانا شروع کر دیا تھا۔ مسز گوتم برداشت نہ کر سکے۔ بچوں کی دیکھ بھال کے لئے گھر میں آیا رکھنے پر وہ بارہا زور دے چکے تھے۔ مگر مسز گوتم تھیں کہ ان کی ایک نہ سنتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ چاہے مسز گوتم کو کمانڈر انچیف ہی کا عہدہ کیوں نہ مل جائے۔ بچوں کو وہ کسی دوسری عورت کے رحم پر نہیں چھوڑ سکتیں۔ ڈاؤننگ کہاں

جا کر مڑی ہو " مسٹر گوتم آپ سے باہر ہو گئے " ان حرا خوروں میں سے ہی کسی کو بھیج دے " لیکن جا کر مر رہنے والی یا کسی حرا خور کی آمد سے قبل ہی وہ خود لڑکھڑاتے ہوئے بیدار ہو گئے۔ میں جاہنپے اور وجے کو تھپتھپانے لگے۔ سُلانے کے ہوائی بوسوں اور گالیوں کے ساتھ ساتھ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر سادھو بن جانے کا درد بھی کرنے لگے۔

مسٹر گوتم نے کمرے میں جھانکتے ہوئے اطلاع دی کہ کھانا پچنا جا چکا ہے اور ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ لیکن اس سے پیشتر کہ وہ پھر سے کچن یا ڈائیننگ روم کا ملاحظہ کرنے چلی جاتیں مسٹر گوتم نے ایک فوجی کواک اور ایک بہت ہی موٹی گالی کے ساتھ انھیں حواس باختہ کر دیا۔ " ڈائیننگ کچھ ہوش کرو " مسٹر گوتم منمنائیں۔ " بچے جاگ اٹھیں گے " اور بڑھکر ان کا بازو تھامتے ہوئیں لیکن انھیں اٹھانے سے زیادہ ان پر گرتی ہوئیں اپنی مخصوص ہنسی کے ساتھ پھر چلیں۔ " چلو اٹھو کھانا کھا لو "

اور میجر اے۔ وی نروتم داس گوتم ایک سعادتمند بچے کی طرح اٹھ کھڑے ہوئے۔

تخیل
جنوری ۱۹۹۹ء

شوکت صدیقی

تانتیا

کرفیو آرڈر کی رات تھی۔ پت جھڑکی تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں اور وہاں جگہوں میں کتے رورہے تھے کیسا نووا ہٹل پر اسرار خاموشی میں اونگھتا ہوا نظر آرہا تھا، رقص گاہ کے ہنگامے سرد تھے، جام منہ اوندھائے پڑے تھے۔ باورچیخانہ کی چمینی سے ابھرنے والے مرغولوں کا کہیں سراغ نہیں مل رہا تھا۔ باہر گلی میں کھلنے والی کھڑکی بند پڑی تھی اور تانتیا دیواروں کے گہرے سائے میں بیٹھا ہوا تھا۔ جب بازاروں کی چہل پہل اُجڑ جاتی اور رات گہری ہو جاتی تو تانتیا اس تنگ گلی میں چلا آتا۔ دھوئیں میں اُلجھی ہوئی باد چرخے کی پھیکی روشنی کو دیکھتا اور کھڑکی پر اُبھرنے والے انسانی سائے کا انتظار کرتا۔ لیکن جب دیر تک کوئی نظر نہ آتا تو وہ جھنجھلا کر چلانے لگتا۔ ابے! کیا اپنے باپ کو بھول گئے! سالو! یہ انتظار ہی کب تک ہوگی؟ اندر باد چرخے خانے میں بیرے ٹھٹھا مار کر ہنستے خاندان ماں گردن نکال کر کہتا "ارے مرا کیوں جا رہا ہے۔ کوئی میز تو خالی ہونے دے" اور تانتیا مطمئن ہونے کے انداز میں مجھوم کر فخرہ لگاتا فافہ کیا بات ہے تیری

جمہور کے راجہ "بڑے خانساں کو راجہ کھلانے کا ارمان تھا۔ یا پھر کوئی جذبہ ہمدردی، یا محض احساس برتری اور یہ ارمان تھا، یا پھر دی یا احساس برتری کہ خانساں کو برابر یہ خیال ستا رہتا تھا کہ باہر اندھیرے میں تانتیا بیٹھا ہوا ہے بڑی بڑھتی جا رہی ہے۔ اس کے اُچھے ہوئے مٹیالے بال اس میں بھیگتے جا رہے ہیں اس کی بھوک آنکھیں کھڑکی کی طرف لگی ہیں۔ وہ دلاستی شراب کی تیز محک پر جان دیتا ہے اور اس کی تلخی اسے مرغوب ہے۔ خانساں اپنے کام میں الجھا رہتا ہے۔ میرے متعدی سے آکر آرڈر پر آرڈر مناتے۔ اور خانساں کو تانتیا کا خیال ستا رہتا تھا۔ قص گاہ میں قہقہے لگتے رہتے۔ جام ٹکراتے رہتے۔ آرکسٹرا کے نغمے تھر تھراتے رہتے۔ پھر کوئی میز خالی ہوتی۔ پھر کوئی بیراچی کچی غذا اُٹیں لے کر آتا۔ کچی ہوئی شراب لے کر آتا۔ اور خانساں کچی کچی غذاؤں پر شراب چھڑک دیتا اور کھڑکی پر جا کر کھڑا ہو جاتا۔ تانتیا اس کو دیکھتے ہی بے تاب سے جھپٹتا۔ لیکن خانساں پیچھے ہٹ کر تانتیا کی بے صبری سے لطف اٹھانے لگتا۔ سالے! اتنی جلدی، بیٹا اصلی شراب پڑی ہے یوں تھوڑی لمبی لگی۔ تانتیا کی گرسنہ آنکھیں جھپکنے لگتیں، ہونٹ پھڑ پھڑانے لگتے اور بکھری ہوئی مونچھیں دانتوں سے اُچھنے لگتیں، وہ خوشامد کرنے لگتا "ارے کیوں جلا رہے ہو۔ سپٹ میں آگ لگی ہوئی ہے" پھر خانساں کو جلد ہی بیروں کے سنائے ہوئے آرڈر یاد آ جاتے مینجر کی ڈانٹیں یاد آ جاتیں۔ اور وہ ٹرے کو تانتیا کے دامن میں اُلٹ دیتا۔ تانتیا خالص فوجی انداز میں اس کو سلیوٹ کرتا۔ مزے لے لے کر ہر چیز کو کھاتا پاس کھڑے ہوئے کتوں کو دھتکارتا اور خانساں کو دُور دُور سے گالیاں دیتا

اور خان ساماں بیوقوفوں کی طرح ہنستا رہتا۔ شاید اسے گالیوں کا بھی ارمان تھا۔

لیکن کھر کی بند تھی۔ تانتیا چلایا بھی، خرشاند بھی کی اور گالیاں بھی دیں۔ اور

بڑے خان ساماں کو نہ راجہ کھلوانے کا ارمان پیدا ہوا، نہ رگ ہمدردی پھر کی

نہ احساس برتری نے ستایا اور نہ گالیوں سے اسے ہنسی آئی۔ چند گھبرائے ہوئے

بیروں کے ساتھ وہ بھی باورچی خانے میں سہا ہوا بیٹھا رہا اور کھر کی کھل نہ سکی۔

تانتیا نے مایوس ہو کر فرش پر اندھیرے میں ٹوٹنا شروع کر دیا۔ سوکھے ہوئے

کچھ ٹوسٹوں کے ٹکڑے اسے مل گئے اور اس نے منہ میں بھر کر انہیں چبانا شروع

کر دیا۔ باسی کھن کے کھٹے پن پر اسے شراب کی تلخی یاد آ رہی تھی۔ اور اس کے نزدیک

ہی ایک مرل ساکتا مزے سے ہڈی چوڑ رہا تھا۔ تانتیا کو اس کے اس طرح ہڈی

چوڑنے پر الجھن ہونے لگی اور اس نے جل کر اس کے ایک لات جھادی ”یہاں تو

بیٹھے ترس رہے ہیں اور یہ سارے موح اڑا رہے ہیں“ کتا چیختا ہوا بھاگا اور اس کی

چینچیں فلک ہوس عمارتوں سے ٹکرا کر گلی کی گھرائیوں میں گونجنے لگیں۔ گلی کے نڈ

پر میونسپلٹی کی لائٹیں جل رہی تھی۔ اس کی دھندلی روشنی میں ایک بارگی کئی کانٹیلوں

کے سائے اُبھر آئے۔ کسی نے چیخ کر پوچھا ”کون ہے؟“ پھر مارچ کی تیز روشنی تانتیا

کے جسم پر لہرانے لگی۔ وہ بدحواس ہو کر دوسری سمت بھاگا اور بندوق کی دھڑ دھڑ

ہوئی آواز پر ہراسہ خاموشی میں اُبھری۔ گولی تانتیا کے پیر کے پاس سے چھپتی ہوئی

گزر گئی۔ وہ دیواروں کے اندھیرے میں دیکھتا ہوا اس سڑک پر آ گیا۔ جو کشادہ بھی

تھی اور روشن بھی۔ اور وہ ایک کوٹھی کے برآمدے میں گھس گیا۔ سب دروازے

بند تھے مگر کونے والے کمرے کی کھر کی کھل رہ گئی تھی وہ اس پر چڑھ کر اندر پھانڈ گیا

اور جھٹ سے کھڑکی بند کر دی۔

اور جب کھڑکھڑاتے ہوئے جوتوں کی بھاری آوازیں دُور ہو گئیں اور سڑک پر سناٹا چھا گیا تو وہ سنبھل کر کھڑا ہو گیا۔ کمرے میں اندھیرا چھایا ہوا تھا روشن دان سے روشنی کی ہلکی ہلکی شعاعیں بھوٹ رہی تھیں۔ دیوار کے پاس ایک لمبی میز پڑی ہوئی تھی، اس پر کچھ کتابیں بکھری ہوئی تھیں، کچھ کاغذات پھیلے ہوئے تھے۔ اور سگریٹ کا ایک ٹین بھی نظر آ رہا تھا۔ تانقیا سے دیکھتے ہی چونک پڑا۔ اور اُسے محسوس ہونے لگا کہ کمرے میں کوئی موجود نہیں۔ کوٹھی کے دوسرے حصے میں نہ کوئی آہٹ تھی اور نہ کوئی آواز۔ اور خاموشی بہت گہری تھی اور وہ میز کے پاس چلا گیا۔ سگریٹ کا ٹین اٹھا کر کھولا۔ صرف ایک سگریٹ نکالی اور ٹین کو پھر اُسی طرح رکھ دیا۔ مگر اس نے سگریٹ سلگائی نہیں بلکہ برابر دالے کمرے کا دروازہ کھول کر اس میں جھلکنے لگا۔ یہاں بھی کوئی نظر نہیں آ رہا تھا اور وہ اس میں چلا گیا۔ اس کمرے میں بھی دھندلی سی روشنی تھی۔ فرش پر پڑنے اخبار بکھرے ہوئے تھے۔ دیوار کے پاس دو خالی پلنگ پڑے ہوئے تھے۔ سامنے کھونٹی پر ایک پُرانا گاونڈن لٹک رہا تھا۔ تانقیا نے اُسے چھو کر دیکھا۔ گاؤن اُونی کپڑے کا بنا ہوا تھا۔ اور تانقیا کو سردی کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ اُس نے گاؤن کو پہن لیا اور ٹھہلتا ہوا دوسرے کمرے میں اس طرح چلا گیا، جیسے خواب میں چل رہا ہو، اس کمرے میں خوب روشنی ہو رہی تھی۔ اور اُس نے پکارنا شروع کر دیا۔

”ارے کوئی ہے یہاں؟“

”کوئی ہے یہاں؟“

”کوئی ہے یہاں؟“

اور تینوں مرتبہ اس کی آواز خاموش دیواروں سے ٹکرا کر شکست ہو گئی اور وہ ایک نرم سے صوفے پر خالی الذہن سا جا کر نیم دراز ہو گیا۔ اس عرصہ میں پہلی بانسے محسوس ہوا کہ وہ بہت تھک گیا ہے۔ اس کا جسم سردی سے تھر تھرا رہا ہے۔ اسے کھانے سے زیادہ آرام کی ضرورت ہے۔ اور وہ خوابیدہ نظروں سے آتش دان پر رکھے ہوئے دھات کے یونانی مجسمے کو دیکھنے لگا اور یہ مجسمہ اس کو اپنی طرح تنہا اور ادونگھتا ہوا معلوم ہوا۔

وہ اٹھ کر آتش دان کے پاس گیا۔ مجسمے کو اٹھایا اور پھر گھبرا گیا جیسے وہ کوئی پراسرار طاقت تھی جو دھات میں سمٹ کر منجمد ہو گئی تھی جیسے وہ صدیوں کا بھٹکا ہوا کوئی راہی تھا جو بڑے حال ہو کر ٹھہر گیا تھا تانٹیا نے سہمی ہوئی نظروں سے ہر طرف دیکھا۔ کمرے میں روشنی ہو رہی تھی، دیواروں کا گہرا سبز رنگ بڑا خواب ناک معلوم ہو رہا تھا۔ خاموشی بہت گہری تھی۔ نہ کوئی آہٹ تھی نہ کوئی آواز۔ اور تانٹیا کا کا جسم سردی سے تھر تھرا رہا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ اور وہ دوسرے کمرے میں گھس گیا۔ یہ کمرہ بھی خالی تھا اور اندھیرا بھی چھایا ہوا تھا۔ باہر کی روشنی کو دروازے پر لہراتے ہوئے پردے نے روک رکھا تھا۔ تانٹیا نے اندھیرے سے وحشت زدہ ہو کر پردے پر ہاتھ مارا اور اسے نوحہ کر فرش پر پھینک دیا۔ روشنی ایک بار کمرے میں گھس کر گھر گئی اور تانٹیا مسکرا نے لگا۔ اس کمرے میں کوئی پلنگ نہ تھا۔ فرش بہت ٹھنڈا تھا۔ تانٹیا کے برہنہ پیروں کے تلوے سنسانے لگے دیوار سے لگی ہوئی دو الماریاں کھڑی تھیں۔ اس نے ایک کو کھولا۔ اندر کچھ میلے

کپڑے پڑے ہوئے تھے۔ اُس نے جھنجھلا کر ان کو باہر پھینک دیا۔ پھر الماری کو اطمینان بخش نظروں سے دیکھنے لگا کہ اب اس کو سردی نہیں لگے گی۔ اب اس کو آرام مل جائے گا۔ اور وہ اس میں سو سکے گا۔ اور جیسے یہ الماری اس کی ہے۔ یہ کمرہ اس کا ہے۔ اور اس کا جی چاہا کہ ایک بار پھر سب کمروں میں جائے۔ اس نے الماری بند کر دی اور اس میں لگا ہوا آئینہ اُس کے سامنے آگیا۔ اس نے اپنے عکس کو دیکھا۔ اُبھے ہوئے مٹیالے بال۔ بکھری ہوئی گھنی مونچھیں۔ گندی سی بے ترتیب داڑھی۔ اور اس دھندلے چہرے پر چھائی ہوئی وحشت۔ اس نے خود کو پہچان کر سچا پننے سے انکار کر دیا۔ اور دھات کے یونانی مجسمے کو کھینچ کر آئینے پر دے مارا۔ آئینہ جھنجھٹا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔ اور الماری کے پیچھے سے ایک کم سن سی لڑکی چیخ کر باہر آگئی۔

”تانتیا نے خوف زدہ ہو کر کہا ”کون ہے ری تو؟“

لڑکی کہنے لگی ”میں نوتو ہوں!“

اور تانتیا کی گھبراہٹ جاتی رہی۔ بلکہ اُسے خود پر غصہ آنے لگا۔ کہ وہ اس کمزور لڑکی سے کیوں ڈر گیا۔ اور پھر وہ اس پر جھنجھلا اٹھا۔ ”حرامزادی تو یہاں کیا کر رہی تھی؟“ لڑکی اب بھی سہمی ہوئی تھی۔

”میں تو ڈر کر یہاں چھپ گئی تھی“

تانتیا پوچھنے لگا ”تو یہاں اکیلی ہی ہے۔ اور کوئی نہیں؟“

لڑکی بتانے لگی ”ڈاکٹر سب شام ہی کو چلے گئے۔ میں نے کہا مجھے بھی اپنے ساتھ موٹر میں لیتے چلو لیکن وہ مجھے اپنے ساتھ نہیں لے گئے۔ اور مجھے اپنے ساتھ

لے بھی کیے جاتے، ہوائی جہاز میں دو ہی آدمیوں کی تو جگہ تھی، اور یہ بتاتے بتاتے لڑکی کے چہرے پر ہنسی کی سی مصوویت چھا گئی، ”وہ بھی چلے گئے، بی بی جی کو بھی لینے گئے اور بے بی کو بھی لے گئے“ لڑکی کچھ اداس ہو گئی۔

تانتیا نے یونہی پوچھ لیا ”یہ بے بی کون؟“

لڑکی کا چہرہ ایکبار لگی نکھر گیا۔ اداسی کا غبار جیسے چھٹ گیا۔ چہک کر بولی ”ان کا ننھا بہت بھولا بھالا تھا۔ بڑا پیارا سا۔ بالکل رُبر کا سا لگتا تھا۔ آؤ تم کو بھی دکھا دوں“ اور وہ باہر والے کمرے کی طرف مڑ گئی۔ تانتیا خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیا۔ لڑکی نے دیوار سے لٹکی ہوئی ایک خوبصورت سے بچے کی تصویر کھائی جو سامنے لڑھکتی ہوئی گیند کے پیچھے بھاگ رہا تھا، اس کے چہرے پر ہنسی تھی اور ہاتھ پھیلے ہوئے تھے۔ لڑکی کہنے لگی ”دیکھو کتنا پیارا ہے“ اور تانتیا سوچنے لگا کہ بچہ گیند پر لپک رہا ہے اور یہ گیند نہیں نمو ہے۔ اور نمو جو اس کو اب نہیں مل سکتی۔ نمو جو اس کے لئے اداس ہے۔ لیکن بچہ ہنس رہا ہے۔ وہ کیوں دہس ہو۔ اس کو کوئی اور نمو مل جائے گی، اور تانتیا نے جھٹ سے دیوار سے تصویر کھینچی اور فرش پر پٹک دی۔

لڑکی غور فرما رہی تھی کہ ”یہ کیا کیا تم نے؟“

تانتیا کہنے لگا ”سالی تو تو بالکل آؤ کی تھی ہے۔ یہ بھی تو اسی سالے ڈاکٹر کا بیٹا ہے جو تجھ کو اس طرح اکیلا چھوڑ کر چلا گیا“ اور لڑکی کی سمجھ میں گویا کچھ نہیں آیا۔ اُس نے ٹوٹی ہوئی تصویر کو اٹھایا اور اُسے دیکھنے لگی۔ اور تانتیا سوچنے لگا کہ یہ لڑکی بالکل آؤ کی تھی ہے اور اس کا اپنا جسم سردی سے تھر تھرا رہا ہے۔ اور اس کے پیر کے

ناسور میں بڑی ٹیس ہو رہی ہے اور وہ لڑکی سے کہنے لگا: ”ارے لڑکی ذرا کڑوا تیل لے آ۔ میں اپنے پیر کے زخم میں ملوں گا۔“ لڑکی اس کے قریب آ گئی۔

”کیا ہوا تمہارے پیر میں؟“

اور تانیتا نے اسے بتایا: ”ناسور ہو گیا ہے۔“

لڑکی اس کے جسم سے دلچسپی لینے لگی ”تو اس کا علاج کیوں نہیں کر داتے؟“ تانیتا کہنے لگا ”بہت تو علاج کر دایا ہسپتال میں بھرتی ہو گیا۔ پر یہ ڈاکٹر سالے ہوتے ہی بد معاش ہیں۔ سالوں نے علاج تو کچھ کیا نہیں۔ بلکہ کہنے لگے کہ تم اپنا پیر گھسنے پر سے کٹوا دو۔ نہیں تو ساری ٹانگ سڑ جائے گی۔ پر میں بھی ایک ہی سیانا نکلا۔ بس جس روز انھوں نے آپریشن کا انتظام کیا۔ میں رات ہی کو وارڈ کی کھڑکی پھاند کر بھاگ آیا پھر کسی سالے کے پاس نہیں گیا۔ اپنا تو کڑوے تیل ہی سے کام چل جاتا ہے۔“

اور نمونے جھٹ سے شلو اور چڑھا کر اپنی پنڈلی دکھا دی۔ دیکھو یہ کتنا برا نشان ہے۔ میرا تو اتنا بڑا زخم ڈاکٹر صاحب نے اچھا کر دیا اور تانیتا سوچنے لگا کہ اس کا اپنا پیر بڑا گھناؤنا ہے۔ اس پر چٹھیرے لپٹے ہوئے ہیں۔ ناسور سے پانی بہہ رہا ہے اور نمونگی پنڈلی بہت خوبصورت ہے۔ اس کے چہرے پر کنواریوں کا اچھوتا بن ہے۔ نرمی ہے، جوانی کی پھوٹی ہوئی شادابی ہے۔ اور پھر نمونہ، نمونہ رہی۔ صرف ایک لڑکی ایک عورت رہ گئی۔ اور تانیتا سوچتا رہا کہ اس گھر میں سب کچھ اس کا ہے۔ بیخوبصورت کمرہ بھی، یہ نرم نرم صوفہ بھی، یہ لہراتے ہوئے پردے بھی، اور یہ نکھری ہوئی سبز دیواریں بھی۔ اور یہ نمونہ، صرف ایک لڑکی، ایک عورت، اور عورت کو اس نے کبھی اتنے قریب محسوس نہیں کیا تھا۔

نمونے تانتیا کو دکھایا۔ اس کے چہرے کی وحشت کو دکھایا اور گندی سی آنکھوں کا وہ انداز کہ وہ شرابھی گئی اور گھبرا بھی گئی۔ اس نے سمجھٹ سے اپنی پنڈلی چھپالی۔ تانتیا ایک بار لگی جھنجھلا اٹھا۔ نمونہ کی طرف بڑھا اور وہ خوفزدہ سی پیچھے ہٹنے لگی۔ تانتیا کی جھنجھلاہٹ بڑھتی گئی اور اس نے نمونہ کو بے ڈھنگے پن سے دبوچ لیا۔ اس کے لباس کو تار تار کر ڈالا۔ اُس کے ہونٹوں کو چبا ڈالا، اُس کے رخساروں کو چبا ڈالا۔ اور پھر اس کی نرم چھاتیوں کو، اس کی گداز باہنوں کو اور اُس کے تمام جسم کو دانتوں سے نوچنا شروع کر دیا۔ نمونہ خوفزدہ سی اس کو دیکھتی رہی۔ پھر چیخنے لگی۔ پھر بے ہوش ہو گئی۔

نمونہ کا برہنہ جسم فرش پر پڑا رہا۔ اس کے جسم پر دانتوں کے نشان تھے۔ رخسار نیلے پڑ گئے تھے اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ باہر رستانی ہوئیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ پھر تانتیا نے نمونہ کے برہنہ جسم پر پونچا ناگاون ڈال دیا اور فرش پر بیٹھ کر سگریٹ پینے لگا۔

تانتیا بیٹھا ہوا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا۔ دھوئیں کے پیچ و خم لہراتے رہے کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ پھر ایک ایک کی کوٹھی کے پچھلے حصے پر ملی جلی انسانی آوازوں کا دبا دبا شور ابھرنے لگا اور تانتیا بیٹھا ہوا چپ چاپ سگریٹ پیتا رہا اور شور بڑھتے بڑھتے قریب آ گیا۔ پھر دیوار پر سے پھاندنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ پھر کوٹھی کے صحن میں قدموں کی پراسرا آہٹیں گونجنے لگیں، پھر کچھ لوگ کمرے کا دروازہ کھول کر کمرے کے اندر آ گئے۔ تانتیا نے ان کو دکھایا، اور خاموشی بے بیٹھا سگریٹ پیتا رہا۔ جیسے وہ ان کو اس سے پہلے بھی دیکھ چکا تھا جیسے وہ ان کو ہمیشہ سے جانتا تھا۔

پھر ان میں سے کسی نے پوچھا ”ابے تو کون ہے؟“
 ”تانتیا!“

اور تانتیا ان کی طرف اس طرح دیکھنے لگا، جیسے کہہ رہا ہو کہ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ پھر انہوں نے جیسے اسے پہچان لیا۔ اور وہ ہنسنے لگے۔ پھر انہوں نے نموت کے متعلق پوچھا۔

”یہ کون ہے؟“
 ”تانتیا نے کہا ”لڑکی!!“ اور وہ مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز بھی تھا اور بے باکی بھی۔

وہ نموت کے جسم کو گھیر کر کھڑے ہو گئے۔ کسی نے گاؤں کو ہٹا دیا اور حیرت زدہ ہو کر کہنے لگا۔ ”ارے یہ تو بالکل ننگی ہے!“ اور سب جھک کر دیکھنے لگے۔
 وہ جھکے ہوئے بے چین نظروں سے اسے دیکھتے رہے!

پھر کسی نے ان میں سے کہا ”ارے یہ تو مر گئی۔ کیا دیکھ رہے ہو اس کو“ اور سب علیحدہ ہو کر بکھر گئے۔ نموت کے جسم پر گاؤں ڈال دیا گیا اور وہ تجسس انگیز نظروں سے ہر طرف دیکھنے لگے۔ پھر کوئی بول اٹھا ”ڈاکٹر سالاسب کچھ لے گیا۔ اب یہاں کیا دھرا ہے؟“ اور وہ تانتیا کی طرف دیکھنے لگے۔

”ابے تو یہاں کیا کر رہا ہے۔ سالے کیا تو بھی جل کے مرجانا چاہتا ہے؟“

اور ایک آدمی منہ بڑھ کر تانتیا کو دروازے کی طرف ڈھکیل دیا ”چل بھاگ یہاں سے!“ تانتیا نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔ ”تو مار کیوں رہے ہو۔ سیدھی طرح کیوں نہیں کہتے۔ میں کوئی یہاں مٹی مار رہی ہوں گا!“

اور تانتیا کو ٹھی سے نکل کر باہر آگیا۔

سڑک پر آکر تانتیا نے محسوس کیا کہ سڑک وہی ہے۔ جھلملاتی ہوئی روشنیاں وہی ہیں۔ اور سامنے ڈاکٹر کی کوٹھی وہی ہے۔ اور یہ کوٹھی اس کی نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کا نہیں ہو سکتا۔ نرم نرم صوفہ اس کا نہیں ہو سکتا۔ لہراتے ہوئے پردے اس کے نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف تانتیا ہے۔ گلاؤں اُس نے نمونہ کو اڑھا دیا تھا۔ دھات کا یونانی مجسمہ اُس نے پھینک دیا تھا۔ اور سگریٹ ختم ہو چکی تھی۔ پھر ڈاکٹر کی کوٹھی میں سے دھواں نکلنے لگا، شعلے ابھرنے لگے اور دروازے چیخ کر شور مچانے لگے۔ پھر کوٹھی کے اندر نمونہ کی گٹھی ہوئی چینی سٹائی دینے لگیں اور تانتیا کو ٹھی کی طرف پلٹ پڑا۔

نمونا بھی زندہ تھی اور نمونا بھی اُسے چاہئے بھی تھی۔

تانتیا شعلوں سے الجھتا ہوا کوٹھی میں گھس گیا۔ پھر نمونہ کے پاس چلا گیا۔ نمونہ اس کو دیکھتے ہی اسے چپ گئی اور وہ اسے لے کر باہر نکلنے لگا۔ اس کے چاروں طرف گہرائیوں دھواں پھیلا ہوا تھا۔ شعلے بھڑک رہے تھے، نکتہ یوں چیخ چیخ کر گرتی تو چنگاریاں دور تک بکھر جاتیں۔ اور شعلوں سے لپٹا ہوا، دھوئیں میں ٹھوکریں کھاتا ہوا وہ باہر آگیا۔ اُس کا چہرہ جھلس گیا تھا۔ داڑھی جل کر اور بھی خوفناک ہو گئی تھی۔ نمونے آنکھ کھول کر دیکھا اور تانتیا کہانیوں کے آسپی بھوتوں کی طرح اس کو بھیا ناک معلوم ہوا۔ اس نے سہم کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور تانتیا اس کو لئے ہوئے فٹ پاتھ پر دیواروں کے کنارے کنارے چلنے لگا۔

تانتیا دیواروں کے سایے میں چلتا رہا۔ چہرے پر جلن ہوتی رہی، اور نمونہ بازوؤں سے جھپٹی رہی۔ پھر ایک پولیس لاری اس کے پاس آکر ڈک گئی۔ کچھ

کانشیل اُتر کھینچے آئے اور اس کو ٹھہرایا۔

”کہاں سے آ رہا ہے؟“

اور تانتیا نے نمو کو سامنے کر دیا۔ میں تو اس لڑکی کو آگ سے نکال کر لارہا ہوں“ اور انہوں نے گاؤن اٹھا کر دیکھا۔ نمو خوفزدہ نظروں سے ان کو دیکھنے لگی۔ تانتیا نے جھٹ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ اے اس کو نہ کھولو، یہ بالکل ننگی ہے“ اور وہ ہنسنے لگے۔

”تو سالے اس کو لئے کہاں جا رہا ہے؟“

تانتیا نے حیرت سے پوچھا ”کیوں؟“

وہ بے ہوشی سے ہنسنے لگے ”ابے! اس کو کھڑا تو کر“

تانتیا نے نمو کو فٹ پاتھ پر کھڑا کر دیا۔ نمو بالکل چپ تھی۔ تانتیا بھی چپ تھا۔ اور وہ سب اس کو دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے اس کا بازو پکڑ کر اسے ایک طرف کر لیا۔ ”یہ ہمارے ساتھ لاری میں جائے گی۔ یہ رفیو جیز کمپ میں رہے گی“ اور وہ نمو کو لے کر لاری کی طرف چلنے لگے۔ نمو اب بھی خاموش تھی۔

تانتیا کہتا ہی رہا ”یہ میرے پاس رہے گی میں نے اس کو آگ سے بچایا ہے اسے میرے پاس رہنا چاہئے“ اور کانشیل نمو کو لے کر لاری میں بیٹھ گئے۔ لاری آگے چل دی۔ اور تانتیا لاری کو خواب ناک نظروں سے دیکھتا رہا۔ لاری دُور ہوتی گئی۔ نمو جس کا جسم لہراتے ہوئے پردوں کی طرح نرم تھا جس کے چہرے پر کنوارے بون کا اچھوتا پن تھا۔ نرمی تھی اور جوانی کی پھوٹی ہوئی شادابی تھی۔ نمو صرف ایک لڑکی ایک عورت، جسے اُس نے اپنے قریب محسوس کیا تھا، جسے اُس نے چھو کر دیکھا تھا

اور لاری اندھیروں میں اوجھل ہو گئی۔ اور تانیتا نے غصے سے فرش پر تھوک دیا پھر وہ سڑک پر چلنے لگا۔

تانیتا سڑک پر تھکا ہوا سا چلتا رہا۔ مگر وہ جاتا بھی کہاں۔ سڑک کے کنارے مکان جل رہے تھے۔ شعلے لہرا رہے تھے۔ دھوئیں کے مرغولے بلندیوں پر بکھرتے جا رہے تھے اور ابھرتی ہوئی انسانی چھینیں بڑی دردناک تھیں۔ وہ آگے نہ گیا اور ایک نیم کشادہ سڑک پر مڑ کر ایک تنگ سی بدرو میں گھس گیا۔ یہاں اندھیرا بھی تھا اور کیچڑ بھی..... اور بڑی تیز بدبو پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے ماچس جلا کر دیکھا کہ وہ کیچڑ میں ٹھکا ہوا کھڑا ہے۔ اس کے قریب ہی ایک برہنہ لاش پڑی ہوئی ہے۔ لاش پھول کر اکڑ گئی تھی۔ زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ آنکھیں ہیبت سے پھٹی ہوئی تھیں جیسے کہہ رہی ہوں کہ دیکھو مجھے کیسی بے بیدردی سے قتل کر دیا گیا۔ میں نے انتقام نہیں لیا۔ مجھے انتقام لینا چاہیے تھا اور وہ وہاں سے ہٹ کر دوسری طرف جہاں زمین خشک تھی اس پر بیٹھ گیا۔

وہ اندھیرے میں بیٹھا ہوا سوچتا رہا کہ اس کے چاروں طرف تاریکی ہے، کیچڑ ہے اور پاس ہی ایک لاش سڑ رہی ہے، جس کی زبان باہر نکل آئی ہے اور آنکھیں پھٹ گئی ہیں۔ باہر تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی ہیں۔ مکان جل رہے ہیں اور دردناک چھینیں ابھر رہی ہیں۔ پھر ایک آدمی گھبرا ہوا سا بدرو کے سامنے آکر ٹھہر گیا۔ تانیتا اسے دیکھتا رہا۔ مگر جب وہ اندر آ کر لمبی لمبی سانسیں بھرنے لگا تو تانیتا کہنے لگا۔

”وہاں کیچڑ میں کیوں کھڑے ہو۔ ادھر آ جاؤ۔ یہاں زمین صاف ہے۔“

آدمی خوف سے چیخ کر بولا ”تم کون ہو؟“ تانتیا کہنے لگا ”میں کوئی بھی ہوں
کچھڑ میں کھڑا ہوں نہ ہے تو وہیں کھڑے رہو۔ نہیں تو ادھر چلے آؤ“ اور وہ آدمی اسکے
پاس آکر چپ چاپ بیٹھ گیا۔

پھر ذرا ہی دیر بعد وہ آدمی آہستہ سے پوچھنے لگا ”تم ہندو ہو یا مسلمان؟“
تانتیا جھنجھلا کر بولا ”میں کوئی بھی ہوں۔ ابے ہندو مسلمان کے بچے پہلے یہ
بتا کہ کچھ سگریٹ و گریٹ بھی ہے۔“

وہ آدمی کہنے لگا ”نہیں میرے پاس سگریٹ نہیں ہے۔ نہ جانے کس
طرح تو جان بچا کر بھاگا ہوں۔ تمہیں سگریٹ کی پڑی ہے؟“ تانتیا ٹھٹھا مار کر
ہنسنے لگا ”ابے جا بے تو بھی پوچھی رہا؟“

وہ آدمی ذرا دیر خاموش رہ کر کہنے لگا ”یہاں تو بڑی بدبو آ رہی ہے؟“ تانتیا
نے ماچس جلائی اور سڑتی ہوئی لاش کو دکھانے لگا ”دیکھو یہ کوئی مرا ہوا آدمی سڑ
رہا ہے۔“ وہ خوف زدہ ہو کر تانتیا کے قریب سرک گیا اور پھر متاثر ہونے کے سے
انداز میں کہنے لگا ”ہا بیچارہ!“

تانتیا کہنے لگا ”یار دُکھ تو مجھ کو بھی ہو رہا ہے۔ پر یہ سرکار بھی بڑی عجیب
ہے۔ اتنا گزشت ہیکار سڑا جا رہا ہے۔ یہی کھپلی جنگ کی بات ہے۔ ہم لوگ برا
کے جنگوں میں لڑ رہے تھے۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ہوائیوں نے ہسٹ کو اور دالی
سڑک بمباری سے تباہ کر دی اور ہم لوگوں کو راشن ملنا بند ہو گیا۔ بس کچھ نہ پوچھو
کہ کیا میتی۔ ہم لوگوں نے سامان لے جانے والی گاڑیوں کے خجروں کو مار کر کھانا
م شروع کر دیا۔ مگر خیر کا گوشت بہت خراب ہوتا ہے۔ سالہاں ہم ہی نہ ہوتا تھا پھر

ہوائی جہازوں سے راشن پھینکا جانے لگا۔ اس میں ہمیں ایسا گوشت ملتا جسے سکھا کر
دبوں میں بند کر دیا گیا تھا۔ سچ کہتا ہوں کیا منے کا گوشت ہوتا تھا۔ اب تمہیں بتا دو کہ
دو زخمیہ اتنے بہت سے آدمی بلوے میں مر رہے ہیں۔ دیکھو کتنا گوشت بریکار جا رہا
ہے۔ سرکار اس کو سکھا کر کیوں نہیں رکھ لیتی۔ کال کے دنوں میں کتنا کام دے گا
پھر کال تو یوں بھی پڑ رہا ہے۔ کتنے ہی بھوکوں کا بھلا ہو جائے گا۔ کہو کیسی کہی جاوے
تانتیا نے اس کی بیٹی پر زور سے ہاتھ مارا، ابے تو تو بہت تگڑا ہے۔ تو مرے گا تو
بہت سا گوشت نکلے گا اور بہت سی چربی بھی نکلے گی۔ اور وہ آدمی خوف سے
اچھل پڑا۔ اس کی جیبیں روپوں کی جھنکار سے کھنک اٹھیں۔ تانتیا نے جھٹ سے
اس کی گردن دبوچ لی۔

”ابے تیرے پاس تو بڑی رقم معلوم ہوتی ہے۔ لا نکال“ اور وہ آدمی گھٹی
ہوئی آوازیں کہنے لگا ”میری گردن تو چھوڑ دو“ تانتیا نے اس کی گردن چھوڑ دی۔
وہ کہنے لگا ”مجھ ستائے ہوئے کو رتا کر تمہیں کیا ملے گا“

تانتیا ہنسنے لگا ”سیدھی سی تو بات ہے۔ رقم ہاتھ لگے گی اور کیا؟ اور وہ اس
آدمی کو دھکا دیکر اس کے سینے پر چڑھ بیٹھا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے گلا دبا کر کہنے لگا
”ابے سیدھی طرح نکالتا ہے یا گھونٹ دوں گلا“ وہ بدحواس ہو کر کہنے لگا ”سب
کچھ اندر کی جیب میں ہے، نکال لو“ تانتیا نے اس کی جیبیں ٹولیں۔ نوٹ نکالے
روپے نکالے اور ریڑھ کی تکیہ نکال لی۔

وہ خوشامد کہنے لگا ”میرے پاس کچھ تو چھوڑ دو“

تانتیا پھر ہنسنے لگا ”ابے جا! بہت دن سائے تم نے ٹھاٹھ کئے ہیں۔ کچھ دن

یوں ہی سی

”تمہارے دل میں ذرا رحم نہیں۔ میرا گھر جل رہا ہے۔ سب کچھ لٹ گیا بیوی کو بھی مار ڈالا۔ بچوں کو بھی قتل کر دیا۔ میری جوان لڑکیوں کو بھگالے گئے۔ اب میرے پاس رہ ہی کیا گیا ہے۔ عزت تھی وہ بھی برباد ہو گئی۔ وہ آدمی بڑا ادا اس معلوم ہو رہا تھا مگر تانتیا ہنستا رہا۔“ اے تو اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے تیری لڑکیوں کو کوئی نہ کوئی قتل ہی جاتا۔ کوئی اور نہ لے گیا وہ لے گئے۔ اس میں کیا ہوا؟

وہ آدمی خاموش بیٹھا رہا۔ اسے تانتیا سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ یہاں سے نکل جانا چاہتا تھا مگر اسے اپنی جان پیاری تھی اور وہ وہیں بیٹھا رہا۔ اور تانتیا نے اسے پھر چھیڑا۔ ”اے خاموش کیوں بیٹھا ہے۔ کچھ باتیں ہی کر“ وہ آدمی جھنجھلا کر کہنے لگا۔ ”تم نے آج تک انسانوں کو دکھ ہی پہونچایا ہے۔ یا اور بھی کچھ کیا ہے“

”تانتیا تمل کر بولا“ اے! میں نے کیا کیا ہے۔ میں نے چلمل قاتی دھوپ میں سڑکوں پر محنت کی ہے۔ کرکڑا قی سردیوں میں پہرہ داری کی ہے۔ میں نے فوج میں بھرتی ہو کر گولیاں کھائی ہیں۔ میں نے چوریاں کی ہیں۔ میں نے جیل کاٹی ہے۔ میں نے مار کھائی ہے۔ میں نے گالیاں کھائی ہیں۔“ اور تانتیا تیزی سے کہتے کہتے ایک بار بے نیازی سے ہنسنے لگا۔ ”اور اب میں بھوکوں مرتا ہوں۔ شرابیوں کا بچا کھچا کھانا کھاتا ہوں۔ گوشت کے ایک ٹکڑے کے لئے کتوں سے لڑتا ہوں۔ اس سردی میں سنان سڑکوں پر ٹھٹھرتا پھرتا ہوں۔ بتاؤ استاد تم نے یہ سب کچھ کیا ہے۔ اور نہیں، تو تمہاری ایسی کی تیسی“ اور تانتیا نے اس کے منہ پر کس کے

تھہر مارا "سالا! آؤ کا پٹھا۔ خواہ مخواہ رعب جھاڑتا ہے۔"

وہ آدمی سہما ہوا سا خاموش بیٹھا رہا۔ مگر تانتیا اس بدروسے اکتا چکا تھا۔ اس آدمی سے اکتا چکا تھا۔ اس اندھیرے سے اکتا چکا تھا۔ اور وہ بدروسے نکل کر باہر سڑک پر آگیا۔ خزاں کی تیز ہوائیں سسکیاں بھر رہی تھیں۔ رات اور گہری ہو گئی تھی۔ ویران عمارتوں کی پشت پر چاند کی زرد روشنی ابھر رہی تھی۔ پت بھڑکے مارے ہوئے سوکھے درخت تار عنکبوت کی طرح اُلجھے ہوئے نظر آ رہے تھے اور تانتیا درختوں کے لرزتے ہوئے سايوں کے تلے چلنے لگا۔ خشک پتے اس کے قدموں کے نیچے آسببی سرگوشیوں کی طرح چرماتے رہے اور اس کی پشت پر گونجنے والی دردناک انسانی چیخیں مدھم ہوتی گئیں اور سنان سڑک پر اس کا سبب سایہ بھوتوں کی طرح جھومتا رہا۔ وہ یوں ہی گم سم سا چلتا رہا پھر ایک موٹر پر سے کسی نے اس کو ٹوکا "کون آ رہا ہے؟" تانتیا نے گھبرا کر دیکھا ایک فوجی سپاہی بندوق سنبھالے ہوئے اس کی طرف آ رہا ہے۔ تانتیا پلٹ کر دیوار کے سايوں میں دبکنے لگا۔ وہ چیخ کر تیزی سے بولا "ہے!! ٹھہر جاؤ" مگر تانتیا نے اپنی چال اور تیز کوئی۔ پھر بندوق کی آواز سڑک پر زور سے تھر تھرائی اور گولی تانتیا کی پسلیوں کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ وہ فرش پر گر پڑا۔ اور سپاہی اس کے قریب آ کر ٹھہر گیا۔

تانتیا نے اس کی طرف دیکھا، پھر اُلجھے ہوئے لمبے میں کہنے لگا "جوان! تمہارا نشانہ بہت اچھا ہے۔ کبھی میں بھی اتنا ہی سچا نشانہ لگاتا تھا۔ پر ان چیزوں کی کون قدر کرتا ہے۔ جنگ ختم ہو گئی اور میرا حال تم نے دیکھ ہی لیا!" اور تانتیا نے

ہاتھوں میں دبے ہوئے نوٹ، وہ بے اور ریز گلدی سب کچھ سڑک پر پھینک دیا
 سپاہی اپنی بندوق کا سہارا لئے ہوئے حسرت سے دیکھتا رہا۔ تانتیا اس کے اس
 انداز پر جھنجھلا گیا "اے دیکھ کیا رہا ہے۔ اس کو اٹھالے۔ سارے اکوڑاکیوں
 بے کمیں ایک دن تیرا بھی یہی حال نہ ہو۔ اے اس وقت یہ رقم کام آئے گی؟
 سپاہی نے اس کے ایک لات ماری اور روپیہ اٹھا کر چل دیا۔ تانتیا کے
 زخم سے خون بہتا رہا۔ اس کا جسم منڈان سڑک پر پھڑکتا رہا۔ ہوائیں سسکیاں
 بھرتی رہیں۔ اور ویران گلیوں میں کتے روتے رہے۔

یہ کرفیو آرڈر کی رات تھی تانتیا کی زندگی کی آخری رات تھی۔ تانتیا مر گیا
 لیکن اس کی پھٹی ہوئی آنکھوں میں ابھی تک ٹھوک زندہ تھی۔

خیال

فروری ۱۹۴۹ء

عصمت چغتائی

کیڈل کورٹ

کچے چمڑے کی مختصر سی گڈی کچھ رنگہیلیاں کیلیں اور نعل ایک آدھ ہٹوڑی، رانہی، سوا اور چند بکسوں۔ یہ ہے اس کا سارا اثاثہ۔ اس کے علاوہ چند پٹے اُدھڑے جوتے ایک اُلھی ہوئی گڈڑی، دو چارٹین کے ڈبے یہ ہے اس کا گھر جس کا ٹھیک ڈاک کا پتہ ہے۔ کیڈل کورٹ کی سوری سے ذرا بائیں طرف کو ایرینی ہوٹل کے سائبان کے نیچے جہاں اوپر سے پھینکے ہوئے کچرے اور پان کی پکیوں سے پوری طرح محفوظ رہا جاسکتا ہے۔ اس کا مکان، گھر، محل، حویلی جو بھی سمجھ لیجئے واقع ہے۔ یہی اس کا وطن ہے اور وہ یہیں کا باشندہ۔ نہ جانے کہاں سے رہتا ہے۔ اور کب تک رہے گا۔ اندازہ تو یہی کہتا ہے کہ صاحب لوگوں کے جوتوں پر پالش کرتے کرتے اسے اس نفع بخش پیشے کو اختیار کرنے کا خیال آیا ہوگا۔ اور یہ خیال جب تک اتار رہے گا جب تک کہ ایک دن اسی جگہ مجبوراً اس کی روح اس کے کڑوے کیلے جسم سے دق ہو کر بھاگ نہ کھڑی ہوگی اور پھر جب وہ حسب معمول گودڑ میں سے جہاں وہ روز سو راج کے ساتھ ساتھ چھپ چکا ہو گا۔ پھر پڑنے جوتوں کی قطار، نگا کر خام چمڑے کی گڈی نہ کھوئے گا تو وہ

راہ گیروں کی ٹھوکروں سے بھی نہ جاگے گا تو نا کے پر کھڑا ہوا سا ہی اپنا فرض انجام دیتا رہے گا۔ سڑک پر موٹریں دوڑتی رہیں گی۔ ہوٹل میں پیالیاں کھٹکتی رہیں گی۔ اور ساری جیتی جاگتی فضا میں وہ سویا پڑا رہے گا۔

پھر جب اس کی نیند کا بھرم کھلے گا تو کیڈل کورٹ کے باسی اور ہوٹل میں آنے جانے والے چہ سیگوئیاں شروع کر دیں گے۔ کتے اس کے سر جسم کو سونگھیں گے۔ اور ببر کھیاں بھینٹائیں گی۔ سرکاری لادری آئے گی اور بحیثیت ایک شہری کے اسے اسکا حق سونپ دے گی۔ نہ جانے وہ وقت کب آئے گا۔ فی الحال تو وہ روز ہوٹل کھلتے ہی جاگ پڑتا ہے۔ انیٹوں کا مضحکہ خیز دریچہ سا بنا کر اس پر ادولٹین کے خالی ڈبے میں پانی چڑھا دیتا ہے۔ ہوٹل کے پاس رہنے میں اسے کتنے ہی فائدے ہیں۔ علاوہ بزنس کی فراوانی کے عمدہ کھانوں کی لذیذ خوشبو سُفت ہاتھ آتی ہے۔ اُلی ہوئی چائے کی پتیوں کو بوری پر روزانہ حفاظت سے اگر سکھالیا جائے تو باقرا چائے تیار کی جاسکتی ہے۔ گویہ پتیاں ابا نے کے بعد خوب مسلنے پر ذرا سا ہی رنگ چھوڑتی ہیں کیونکہ ہوٹل والا غواؤں کا پہلے ہی کئی کئی بار غونچوڑ لیتا ہے جب پھینکتا ہے۔ گرم گرم سیلا پانی پی کر وہ اطمینان سے اپنی دوکان سجانے میں مشغول ہو جاتا ہے۔ شاید فورٹ کی دوکانوں کے بڑے بڑے مالک بھی اتنا وقت سجانے میں نہیں صرف کرتے ہوں گے۔ وہ بڑی احتیاط سے کچے چمڑے کی گڈی کھولتا ہے ایک ایک ٹکڑے کو جانچتا پڑتا ہے۔ پتہ نہیں وہ اپنی چندھی آنکھوں سے ان ٹکڑوں پر کیا نگہ راکھتا ہے۔ پھر سر ہل کر انھیں درجہ بدرجہ ترتیب دیتا جاتا ہے پھر دوز نگہبانی کیلوں کی ڈبیاں اور شیشیاں نکال کر دواؤں کی طرح سجاتا ہے۔

نفل اور چمپل کیلیں بڑے حساب سے بھاتا ہے۔ پھر پُراے جوتوں کی قطار لگانا شروع کرنا ہے۔ اس سجاوٹ میں وہ برابر دو بدل کئے جاتا ہے حتیٰ کہ کوئی گاہک اگر اسے چونکا نہ دے۔ ایسی صورت پیدا ہوتے ہی وہ نہایت پھرتی سے جوتے کی بنض دیکھ کر نسخہ تجویز کر دیتا ہے۔ پھر مزے لے لے کر ایک ماہر فن جراح کی طرح وہ اس کا ایک ایک جوڑ ٹھوک بجا کر دیکھ لیتا ہے۔ جیسے اسے عشق ہو اُن جوتوں سے۔ ہاتھ میں لیتے ہی پہلے تو وہ بڑے پیار سے اُسے اُلٹا پلٹتا ہے۔ پھر گاہک کی طرف دیکھتا ہے گویا پوچھتا ہے۔ اب لائے ہو بیچاے کو۔ اب اس میں جان کہاں۔ خیر دیکھتا ہوں۔ خدا پر بھروسہ رکھو۔ اور پھر ازار چل پڑتے ہیں۔ جھٹاپٹ سوا چمڑے میں ڈبکیاں مارتا ہے۔ زنگہیاں کیلیں اپنی اپنی جگہ ڈھونڈھ کر ٹھس جاتی ہیں اور تھوڑی کھٹاکھٹ معاملہ فٹ کر دیتی ہے۔ گاہک پر مڑ کر تاسکراتا چل دیتا ہے اور وہ پھر جوتوں کی قطار نئے سرے سے جاذب نظر انداز میں جمانے لگتا ہے۔

کیڈل کورٹ کی سواری کے دائیں جانب ایک گیرج ہے۔ جس میں کسی زمانے میں سوٹر رہا کرتی تھی۔ پر اب وہ سوٹر تو سڑک کے کنارے کھڑی رہتی ہے اور اس کی جگہ پنہ رہ آدمیوں نے پھین لی ہے۔ بیس فٹ مربع جگہ میں پنہ رہ جی کس آسن سے اُٹھتے بیٹھتے ہیں یہ کسی نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیونکہ گیرج کا دروازہ اوپر سے ہمیشہ نیچے کھنچا رہتا ہے۔ صرف جھک کر جانے کا انتظام ہے۔ اگر آپ کو شوق ہو تو کیڈل کورٹ کے سامنے فٹ پاتھ پر اکڑو بیٹھ جائیے تو آپ کے گیرج

کے اندر بہت سے سیلے پیر، کھلے گھٹنے اور بڑھنہ کندھے آپس میں گتھم گتھا نظر آئیں گے۔ یہ اعضائے جسم عورتوں کے بھی ہیں اور مردوں کے بھی۔ ماؤں کے بھی اور بہنوں کے بھی۔ بہوؤں کے بھی اور بیٹیوں کے بھی۔ پتہ نہیں وہاں کیا پکتا ہے۔ اور کیا کھیا جاتا ہے۔ اب کھلے ہوئے انسان کی بڑھیشہ بھیکے دیا کرتی ہے۔

اور وہ موٹر جو کچھ دنوں پہلے گیرج میں شان سے رہا کرتی تھی اور سڑک کے کنارے منہ سبورا کرتی ہے روز صبح باپ بھائی یا بیٹا گیرج کے ادھ کھلے پھاٹک میں سے گردن نہوڑا کر نکلتا ہے اور سوچی سے ذرا فاصلے پر اپنے ذریعہ آمدنی کو چمکا کر دکھا کر آئینہ بنالیتا ہے۔ رات کے چھوڑے ہوئے باسی پھول جھوٹے پتے اور ٹوٹے گلاس سوری میں جھاڑ دیتا ہے۔ اور اپنا کاسہ گداؤں جلا کر روانہ ہو جاتا ہے۔

گیرج اور ہوٹل کے بیچ میں ایک پھاٹک ہے یہ کیڈل کورٹ کا پھاٹک ہے جس کے کھمبے پر مالک مکان کا نام اور عمارت کا نام اور سال تعمیر کنندہ ہے یہ عمارت کیڈل کورٹ ہے۔ کورٹ کے معنی ہیں کچہری، جہاں مقدمے اور چالان وغیرہ ہوتے ہیں۔ مگر یہاں ایسی کوئی حماقت نہیں ہوتی وہاں یہ اور بات ہے کہ نچلے طبقے پر رہنے والے فلم اِستار سے حکومت کو خاص قسم کی پُر خاش ہو گئی ہے۔ اس فلم اِستار کو آپ نہیں جانتے چونکہ اس نے کبھی کسی فلم میں کام نہیں کیا۔ پھر بھی وہ فلم اِستار ہے کیونکہ اسے اُمید ہے کہ ایک نہ ایک دن ضرور فلمی دنیا کو اپنی حماقت پر رحم آئے گا اور وہ کسی فلم میں جلوہ افروز ہو کر رہے گا۔

اس کا ذریعہ آمدنی اسیدواری ہے۔ وہ اسی امید پر جیتا ہے۔ دیسے اسے کسی نے کبھی بغیر گاڑی کے کہیں آتے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ ہمیشہ مرغ زریں کی طرح ٹھمکتا ہیٹ کا چھبھ موٹے ایک سے ایک عمدہ کار سے اترتا چڑھتا دیکھ جاتا ہے کتنی ہی فلمی پریاں اسے ہیرو بننا چکی ہیں۔ جس فلم کمپنی میں جاتا ہے۔ وہاں کی ہیروئن کو لے اڑتا ہے۔ وہ تو مسند ہے خوب رو ہے۔ اس کی پیشانی سے بے رحمی ٹپکتی ہے پر منہ کنواریوں جیسا بھولا ہے۔ وہ نیلے پنپے اور سبز چنگھاڑتے ہوئے رنگوں کے کپڑے پہنتا ہے اور بالوں میں مسسٹوچی خم بنواتا ہے اور جب فلمی پریاں اس کے لئے کالے بازار سے وہسکی کی بوتلیں لاتی ہیں تو انھیں خالی کر کے وہ ان کے سروں پر پھونکتا ہے۔ اور جب وہ حاملہ ہو جاتی ہیں تو بڑا کارآمد ثابت ہوتا ہے۔ باوجودیکہ وہ اس قدر جلا دقلم کا مرکھنا دیو ہے۔ پھر بھی اس کے گرد ہمیشہ پریاں پھڑپھڑایا کرتی ہیں۔ شام پڑتے ہی اس کے یہاں گرد و نواح کے رنگین مزاج جمع ہو جاتے ہیں۔ آئے دن ناچ و رنگ کے جلسے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ بڑے مقدس انداز میں ان پریوں سے شادی رچا لیتا ہے۔ پھر کچھ دن کے لئے کیدل کورٹ کی نجی منزل میں سوت سی ہو جاتی ہے۔ سارے قہقہے چھپے ایک اُجاڑ قسم کی خاموشی میں ڈوبا جاتے ہیں۔

پھر اس کے بالوں کے خم خم ہونے لگتے ہیں۔ سوٹ ماند پڑ جاتے ہیں اور نجی منزل میں چھوٹے چھوٹے زلزلے آنے لگتے ہیں کیونکہ وز آہی کسی فلمی ہیروئن کو شہت سے ایک ہیرو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اور وہ دوبارہ بالوں میں خم ڈلو کر تلاش میں جُت جاتا ہے۔ اور پھر خالی بوتلیں سروں پر پھونکتی ہیں۔ کیدل کورٹ کے نواسیوں

کی نیندیں اُچھٹی ہیں اور ایک دن بند ٹوٹ جاتا ہے۔ اس کی بیوی بچا کچا مال سمیٹ کر نو دو گیارہ ہو جاتی ہے اور اس کے بعد پھر وہی چہچہ شروع ہو جاتے ہیں اور اسی طرح یہ زندگی کی چرخی چلتی رہے گی۔ یہاں تک کہ ایک دن وہ سچ مچ میر و بن کر پر دو سیمیں پر جلوہ افروز ہو جائے گا۔ یا اسی اسید میں اس کے گھنیرے بال عمر کی اندھیری وادیوں میں منتشر ہو جائیں گے۔ اس کی کھنٹی ہوئی بھنوں بھک جائیں گی اور چمکیلی آنکھیں گدلا جائیں گی۔ اس کے تنے ہوئے پٹھے بھول کھا جائیں گے۔ چیمے جیسی مکر پھیل کر پھکنابن جائے گی۔ اور پھر نہ ہی پر یاں اس کے گرد منڈلائیں گی اور نہ سر مل پر خالی دھسکی کی بوتلیں پھڑوائیں گی۔ اور پھر وہ ٹٹی کھٹی طوائف کی طرح..... نہ جانے وہ کیا کرے گا۔ زندگی اسے بھٹی جوتی کی طرح گھسیٹے گھسیٹے ایک دم چھوڑ کر چلدے گی۔ اور پھر؟ پھر نہ جانے کیا ہوگا۔ اس کا گھر کوئی دوسرا اسید وار لے لے گا۔ اور اسید کی سٹح جلا کر دوکان سجالے گا۔

دو نوینے طے کرنے کے بعد کیڈل کورٹ کا پہلا مالا ہے۔ یہاں ایک مڑٹی جوڑا رہتا ہے۔ چھوٹا سا خاندان۔ نوجوان میاں اور کسن بیوی۔ اور ننھا مٹا سا ایک بیٹا اور ایک بوڑھی لڑاکا ماں۔ نوجوان کہیں فوٹ میں کلر کی کرتا ہے اور کسن بیوی کسی لوکل اسکول میں معلمہ ہے۔ دونوں کی مجموعی کمائی ایک سو دس روپے ہے۔ نوجوان گریجویٹ ہے اور اس کی بیوی سیرک پاس۔ اور یہ دونوں مل کر ایک سو دس روپہ کما لیتے ہیں۔ بیالیس روپہ مکان کا کرایہ باقی اسٹھ روپے میں کالے بازار سے گیلے کوئلے اور کرکری شکر کے علاوہ چار جانوں کا کھانا پینا سیر تفریح سب کچھ ہو جاتا ہے۔

جب ہندوستان آزاد نہ تھا تب بھی یہ خاندان یہیں رہتا تھا۔ جب یہاں پر ایک باپ بھی تھا۔ یہ گھر ہمیشہ مشہور لیڈروں کی تصاویر سے آراستہ پیراستہ رہا اور جب ہندوستان آزاد ہو گیا تو سب سے زیادہ روشنی اور جھنڈیاں انہیں کی بالکونی پر لگی تھیں۔ گھر کے دروازے پر سیڑھیوں پر اور تصویر کے چوکھٹے میں فریم کیا ہوا۔ ”جے ہند“ نہایت روشن اور سنو رہے۔ کمرے کی سب سے بڑی دیوار پر سو بھاش بابو کی سیٹ کرسی ہوئی تصویر ہے اس کے اوپر کچے سوت کے ہار پڑے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ گئے سال کا ذکر ہے۔ اس سال ۱۵ اگست کو ان کی بالکونی میں جھنڈوں کی تعداد سکڑ گئی تھی۔ اور دیئے دو چار ہی گھنٹے ٹٹما کر رہ گئے تھے اور دیوار پر لکھا ہوا جے ہند ماند پڑتا جا رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ پندرہ اگست کو جب آزادی آئی تو گورنمنٹ نے کنٹرول نہیں کیا اس لئے ساری آزادی بلیک مارکیٹ میں دھری گئی جس کا جی چاہے آزادی لے آئے۔ پر ذرا مشکل سے ملتی ہے کیونکہ وہی بات ہے کہ مانگ زیادہ ہے اور سپلائی کم۔ آزادی کوئی ایسی ویسی چیز تو تھی نہیں کہ دھوپ اور ہوا کی طرح ہر ایک ایسے غیرے نکتہ خیرے کو بانٹ دی جاتی نہایت احتیاط سے سینت کر رکھی گئی ہے۔ وقت ضرورت بانٹ دی جائے گی۔

اور اسی بٹوارے کی آس لگائے یہ جوڑا زندگی کا قرض اتارنا چلا جا رہا ہے۔ یوں ہی جے ہند اور قومی لیڈروں کے سائے میں کمر جھکائے ایک سو دس روپے میں گھر کی آگ سلگتی رہے گی۔ یوں ہی نوجوان یہاں سے فوڑٹ اور فوڑٹ سے گھر آداگوں میں جُتار رہے گا۔ اور کس بیوی ددپہر کے وقفے میں ننھے کو دودھ پلانے لپنتی دوڑتی آتی رہے گی۔

پھر ایک دن یہ نوجوان اپنی جگہ سُنے کو سوئپ کر چل دے گا اور وہ ننھا جوان ہو کر اور بھی بڑے بڑے لیڈروں کی تصویروں سے کمرے کو سجائے گا اور سیڑھیوں پر لکھا ہوا "جے ہند" نئے رنگ سے جگمگا اُٹھے گا۔ پھر ایک سو دس روپے آئیں گے اور گھیلے کوئلوں اور کمری شکر کے بھینٹ چڑھ جائیں گے۔

دو زینے اور چڑھیئے۔ نئی زمین سے چار زنیوں کی اونچائی پر ایک نہایت اعلیٰ خاندان کی اصلی حیثی جاگتی فلم اسٹار سکونت پذیر ہے۔ وہ سیری سہیلی ہے۔ یہ سیل جول اس زمانے کی یادگار ہے جب میں نے ممبئی میں پورے طور سے قدم نہ ڈالے تھے۔ اور ہر فلم اسٹار کو جیتا جاگتا دیکھ کر حچیں نکل جاتی تھیں۔ عرصے سے ہم ایک دوسرے کی خوشی اور غم میں شرکت کرتے آئے ہیں۔ راضی خوشی نہ سہی کم از کم مجھے تو اس کے سارے غموں میں شرکت کرنا ہی پڑتی ہے۔ ویسے وہ دیکھنے میں اچھی خاصی انسان معلوم ہوتی ہے۔ مگر ایک نہایت ہی مکروہ لب اس کو چمٹ گئی ہے اور وہ ہے عشق بازی، وہ تعلیم یافتہ ہند ہے لہذا اس کے عشاق میں عموماً شعراء، ادیب اور جرنلسٹ ہی پائے جاتے ہیں۔ سیری سہیلی کا کہنا ہے پتہ نہیں کہاں تک درست ہے کہ وہ سب کے سب اس کے عشق میں گرفتار ہیں یا کبھی گرفتار تھے یا گرفتار ہونے کے آرزو مند ہیں۔ پتہ نہیں اسے یہ شبہ کیوں ہو گیا ہے کہ میں عشق کے سلسلے میں ایکسپریٹ ہوں کیوں کہ وہ ہمیشہ تازہ واردات کے موقع پر مجھی سے رائے لیتی ہے جہاں اس کے تازہ عاشق سے چشمک چلی جو کہ ضرور چلتی ہے چونکہ وہ عشق صرف لڑنے، روٹھنے اور سنسنے کے لئے کرتی ہے تو میرا دم سوکھ جاتا

ہے۔ آئے دن سیری جان پر مقدمے دائر ہونے لگتے ہیں اور تو اور اسے عشق کے جُملہ مراحل طے کرنے کے لئے میرا ہی ٹھہر موزوں منظر آتا ہے۔ میرے ہی صوفوں پر روٹھے نئے ہیں۔ میرے ہی گلدانوں سے ایک دوسرے کے سر پھٹتے ہیں اور بعض زلمے میں تو مجھے خود اپنے کمر میں باقاعدہ کھڑکار کر ہوک بجا کر جانا پڑتا ہے۔ کتنی بار جی چاہا کہ دوس تم نے مجھے کیا سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے یہ دکھڑے سننے کے لئے میرے پاس وقت نہیں کیا میں ایسی بے مصرف ہوں کہ سوائے تم جیسی ناکارہ چیز کے اور کوئی اکھن سیری زندگی میں نہیں۔ میں بیٹھ کر تمہارے عاشقوں کے دکھڑے سنوں یا یہ سوچوں کہ اناج کتنا کم ملتا ہے راشن پر۔ چانول تو جیسے بونے سے پہلے بیج سڑ گیا تھا۔ جب سے کنٹرول کھسکا ہے آنکھیں لٹھے مل کو ترس گئی ہیں۔ کہتے ہیں کفن کا کوٹ ملتا ہے۔ کاش مرنے سے پہلے وہ کفن والا اٹھامل جائے تو ایک عزارہ مرنے سے بن جائے۔ پھر شکر میں کتنی دھول ہوتی ہے۔ جانو گئے ہی کر کرے ہوئے جانے لگے ہیں۔ پر تم کیا جانو ان باتوں کو۔ یہ جو عاشقوں کا چہرہ کا بیٹھ بٹھائے جان کو لگا بیٹھی ہو کہ سال کے بارہ جینے بس ان ہی کی جان کا رونا کہ اب کون سی فصل آئی۔ کون سے کاٹے جائیں اور کون سے تازہ بوئے جائیں۔ کن کی ادھیڑ بن کی جائے۔ اور کون سے جھاڑ پونچھ پتھیلین کی گولیاں ڈال کر اسٹور کر لیتے جائیں کہ وقت ضرورت کام آسکیں۔

اور پھر میرا جی ابل اٹھتا ہے۔ اور سوچی کی خام چمڑے اور پرانے جو توں والی دکان آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ مجھے اس کے عاشق جو توں کی ایک طویل قطار کی طرح سلوم ہوتے ہیں۔ ادبچی ایڑی کے۔ نیچی ایڑی کے، بغیر ایڑی کے، ولاستی، ہنڈستانی سینڈل اور واکنگ شو، ڈاننگ شو اور پیٹ فارم شو، واپلے، سنہرے، چمکیلے اور

پھٹے ہوئے چپے اور گھٹنے پر کوئی بھی توان میں سے فٹ نہیں کسی کا پنجہ کاٹتا ہے تو کوئی
اڑی پر چھالا ڈالتا ہے کسی کا تسرہ ڈھیلا تو کسی کا بکسواننگ کوئی بھی تو ایسا نہیں کہ مزے
سے پیر میں ڈال کر زندگی کی گڈنڈی پر ٹھکتی لچکتی چلی جاؤ۔

ان کے تازہ ترین عاشق سے سیرا پرانا سیر ہے۔ وہ ایک عرصے سے مجھ سے
ایک فلمی کہانی لکھوانا چاہتا ہے اور اتنے بھاؤ تاؤ کر رہا ہے کوئی دم میں کمر ٹوٹا
چاہتی ہے۔ اور وہ بھی سمجھ گیا ہے کہ کچھ دن بعد میں اس کی مرضی کے مطابق کہانی
اس کی مرضی مطابق داسوں پر لکھنے پر مجبور ہو جاؤں گی پھر اس میں وہ جملہ رد و بدل
کر کے اپنی پوٹھی داشتہ کو میرے تخیل کی پندرہ سالہ چھو کری بنا دے گا اور تھل تھل کرتے
رہنے جیسے سیر کو جو حاملہ عورت کی طرح پھیل پھیل کر چلتا ہے اور جس کے سینے پر اتنا گوشت
ہے کہ باسانی بتیں نمبر کی برنیر پہن سکتا ہے جو اس سال سیر کا پارٹ ٹے ڈے گا۔ پھر
جب یہ بوڑھی گھوڑی اور ڈھیلا ہاتھی پھدک پھدک کر باغوں میں دو گائیں گائیں گے
میرا سر شرم سے نیچا ہو جائے گا۔ میں کسی کو نہ بتاؤں گی کہ یہ کہانی میں نے تخلیق کی
تھی۔ کیونکہ میں جانتی ہوں کہ وہ کہانی ہنگے کوٹلوں، بھنگی شکر اور کیاب لٹھے نے
سوچی تھی۔ کالے بازار کے سکون نے اسے خریدا تھا اور مجھے جو معاوضہ ملا اس سے
میں کالے بازار سے لٹھا اور ملل خریدوں گی۔ اور بھگے کوٹلے کے اس کی آنچ سلگتی رہے
اور پھر مجھے کہانی لکھنے کا معاوضہ ملے۔ یہ ایک عجیب و غریب چکر ہے جس میں فلم ڈائریکٹر اور
کالا بازار ایک دوسرے کی دم پکڑے چک پھریاں لے رہے ہیں۔ میں فلم ڈائریکٹر
کو اور فلم ڈائریکٹر کا لے بازار کو اور کالا بازار مجھے مضبوطی سے پکڑے ہوئے
ہیں۔ اس چکر میں مجھے کتنی تسلیاں آتی ہیں!۔ خالی تسلیاں پھل نڈارو!۔ اور یہ

متلیاں یونہی آتی رہیں گی۔ یہاں تک کہ فلم اسٹار کے چہرے بال بال بھر جائیں گے چہرہ ناقابلِ مرمت ہو جائے گا۔ اور وہ اپنے عاشقوں میں سے کسی ایک کے حق میں قرعہ ڈال دے گی۔ اور اس کے گھر میں بیٹھ کر سوئی نہ ہونے کی فکر میں پڑی چولا کرے گی۔ اور ایک دن فلمی کہانی لکھتے لکھتے میں اپنا قلم جبا کر نگل جاؤں گی۔ اور ان گیلے کونلوں کو اتنا پھونکوں گی کہ وہ بھرک اٹھیں گے۔

اگر آپ کی ٹانگیں شل نہ ہو گئی ہوں تو دوزینے اور طے کر ڈالنے یہ کیدل کوڑ کا تیسرا مالا ہے۔ اگر آپ دروازے پر دستک دیں تو ایک اجاڑ صورت مرعی دروازہ کھول کر جھانکے گا اور سہم کر آپ سے درخواست کرے گا کہ بھائی غل کیوں مچاتے ہو خواہ غل، بالکل نہ چر رہا ہو۔ یہ بے چارہ ایک مزدور پیشہ آدمی ہے۔ یہ جو آپ کو سمندر کے کنارے چاٹ پکڑی کی دو کانیں منظر آتی ہیں۔ یہ قریب قریب نصف اسی کی ہیں۔ جہیں اس نے ٹھیکہ پر دے رکھا ہے۔ وہ نہایت ذلیل دُبے کے ٹھگ ہیں اور بہت کم منافع لاتے ہیں۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ سیرین لائن پر اس کی ایک قطار میں تین عمارتیں ہیں۔ باندرا میں دو نیگے ہیں۔ ایک تو غریب نے اپنے ذہنی مصرف کے لئے بنوایا تھا۔ تمام ایر کنڈیشن کرایا مگر پھر شرنا دھقیوں پر دیا کھا کر صرف پچیس ہزار پگڑی لے کر دیدیا۔ بے چارہ بلڈنگ اپنے لئے بناتا ہو لوگ لے لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خود اس بوسیدہ عمارت میں رہتا ہے۔ اب تو یہ حال ہے کہ مکان کی نیو پڑی اور پگڑیاں ٹٹکیں۔ کرے بھی تو کیا؟ لوگ چھوڑتے ہیں نہیں۔ اب وہ دن دور نہیں کہ وہ اپنے موجودہ مکان کو پگڑی پرے کر خود فٹ پاتھ پر سوچی کے شانے سے شانہ ملا کر پڑ جائے گا۔ دنیا اسے

سرمایہ دار سمجھتی ہے حالانکہ اس کی روح تنگ ننگی بچتی ہے۔ اس کا سارا روپیہ کاروبار میں پھنسا ہوا پھولتا جا رہا ہے۔

ان مکانوں کے علاوہ فٹ پاتھ پر کپڑے کی اس کی ہزاروں چھوٹی چھوٹی دکانیں ہیں۔ یہاں وہ مل سے پورے تھکان لاکر ان کے کٹ پیس بنا کر کالے بازار کے بھاؤ بیچتا ہے۔ یہ فٹ پاتھ پر سارے مہینے میں کالا بازار بڑا جگمگاتا ہے۔ مگر اسے نہ پولیس کا سپاہی دیکھتا ہے نہ ہمارے دلیس کے مقدس لیڈر جیسے وہ جادو کی ٹوپی پہنے ہو۔

دو زینے اور گھسیٹ ڈالے۔ اپنی ٹانگوں کو ویسے دم تو نہ رہا ہو گا۔ یہ کیڈل کورٹ کی چھت ہے۔ یہاں صرف ایک کوٹھڑی ہے جس میں مالک مکان کا خالو کوڑا مثلاً پرانی تنگی ٹوٹی ہوئی کھڑکیاں۔ موٹر کے گھٹنے ہوئے ٹائر، خاک، دھول، جھینگرا اور مکڑیوں کے درمیان ایک سیلی سی درمیانی ہاتھوں سے بھجائی نظر آئے گی۔ ایک طرف کچھ نئے پرانے کاغذوں، رسالوں، اخباروں کا ڈھیر، رسی پر میلے کپڑے، ایک کونے میں ایک انگیٹھی جس پر سیاہ المونیم کی کیتلی اور دو چار پڑیاں چائے گڑ، شکر کی۔ ان چیزوں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہاں کوئی انسان کی قسم کی شے بھی بسیرا لیتی ہے۔ بہت کم لوگ ہیں جو اس پراسرار ہستی کے دیدار سے مستفید ہو چکے ہیں۔ رات کو آخری ٹرام کے رک جانے کے بعد کیڈل کورٹ پر حیرت انگیز سناٹا چھا جاتا ہے۔ ایک پراسرار قدموں کی چاپ گونجنا شروع ہوتی ہے۔ پتی ملی تھکن میں ڈوبی ہوئی چاپ جیسے ہزاروں قدم ایک لے سڑیں غرق چل پھرے ہوئے ہوں۔ پھر یہ چاپ کیڈل کورٹ کی طرف سرکنا شروع ہوتی ہے

اور پھاٹک میں داخل ہو کر ایسے اور تاریک زونیوں پر رنگنے لگتی ہے۔ اُسی وقفے سے اسی وزن سے قدم ایک ایک میٹر بھی پر گرتے اٹھتے ہیں۔ اور بغیر سستائے کیڈل کورٹ کی چھت پر پہنچ جاتے ہیں۔ اگر کبھی رات کو ایک بجے کے بعد کیڈل کورٹ میں آنکھ کھل جائے تو آپ ان قدموں کو سننے سننے کا تپ اٹھیں گے۔ جیسے کوئی روح عالم بالا کو چڑ رہی ہو ایک ایک چاپ گن لیجے۔

یہ قدم ایک عجیب غریب شے کی ملکیت ہیں۔ میں اسے شے ہی کہوں گی کیونکہ کیڈل کورٹ کے باسی نہ اس کا نام جانتے ہیں نہ مذہب۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے انھیں بھی شک ہے کہ وہ پتہ نہیں زندہ ہے یا کسی مُرنے کا بھوت۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کوئی پریشان روح ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں سرکاری جاسوس ہے کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ فرار شدہ مجرم ہے اور اس کے نام کا وار نکلا ہوا ہے۔ اور واقعہ بھی کچھ اسی قسم کا ہے۔ ایک بار سنا کہ وہ ایک ایسے انجاء سے وابستہ ہے جس کا ہر پرچہ ضبط ہو چکا ہے یا قابل ضبط ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ کسی مشاعرے میں اس کو پولیس نے دھر لیا۔ پھر ایک نائک میں کچھ ایسا فساد اُٹھ کر مظاہرہ کیا کہ پولیس نے گھیر لیا۔ مگر اس کی ہستی کچھ بھپسلی ہے کہ نہ جانے کہاں دبک جاتا ہے۔ وہ جیسے کھٹل ہوتا ہے ناخدا کی قسم کا گدھی میں کاٹ لیا اور اس سے پہلے کہ شکار سنبھلے پنڈلی میں چنک لیا۔ پنڈلی مسلی تو کمر میں دو ڈرے ڈال دیئے۔ تو یہی صفت اس کی ہے۔ گورنمنٹ جنھلار ہی ہے، کھلار ہی ہے اور سرپیٹ رہی ہے۔ پولیس : ڈر رہی ہے۔ مگر یہ اس کی ٹانگوں میں سے نکل کر بھاگ جاتا ہے۔ کیڈل کورٹ کے سارے کرایہ دار جانتے ہیں کہ وہ یہاں

رہتا ہے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں کہ اسے پکڑو ادے۔ ایک دفعہ کسی نے کوشش کی بھی تو وہ پولیس کے جانے سے پہلے جھینگ بن کر غائب ہو گیا۔ اور پھر کئی مہینے وہ پراسرار پردوں کی چاک کیڈل کورٹ کے زینوں پر نہ سرسرائی لیکن پھر ایک دن اسی وقت اسی طرح وہ ہزاروں پاؤں ایک نئے سر میں ڈوبے، پھر سے چڑھنے اترنے لگے جن لوگوں نے اسے دیکھا ہے ان کا کہنا ہے کہ وہی پھٹا پتلون او قیص ہے۔ وہی پچکے گال اور الجھے ہوئے بال ہیں۔ شاید یہ وہی لوٹ کر آ گیا ہے۔ مگر شاید۔ کیونکہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔

اور یہ پراسرار قدم ہمیشہ اسی طرح رات کی پراسرار تاریکی میں گونجتے رہے ہیں۔ ایک تھک جائیگا تو دوسرا چوڑان کی جگہ لے لے گا۔ اور دوسرا تھک جائیگا تو تیسرا او یہ لامتناہی قدموں کا سلسلہ اسی طرح بغیر نفز ش کھائے چلتا ہے گا اور ایک ایک قدم ہزاروں قدموں میں بستا چلا جائیگا تو یہ کیڈل کورٹ ہے اوپر سے نیچے تک، فٹ پاتھ سے لیکر خالی آسمان تک الٹاپ کو ایک ہلنگ جگہ کی ضرورت ہو تو ہمت سے کہیے۔ وہ آپ کی نہایت نامعقول بگڑی کے عوض میں ایک آدھ کو نا کھ راہنے کو دیدے گا۔ وہاں آپ مزے سے بیٹھے اس امید پر کہ ایک دن کچھ نہ کچھ ہوئے گا۔ جب یہ لیڈروں کی تصویریں جاگ پڑیں گی اور دشکر میں سے ریت کے ذرے چھان ڈالیں گی۔ ان گیلے کو لموں کو اتنا دھونکیں گی کہ ان میں سے شعلے بھڑک اٹھیں گے اور یہ ٹھٹھان اور فالتے ختم ہو جائیں گے اور موچی کے سر پر کوڑا نہ بر سے گا۔ اور کیڈل کورٹ کی چھت پر چھپے ہوئے جھینگ، بوسیدہ مال کو چاٹ جائیں گے مگر نہیں بھلا کہیں تصویریں بھی جاگا کرتی ہیں

فکرتونسوی

میرے پیارے ابا

نہ جانے میرا یہ خط تھیں ملتا بھی ہے کہ نہیں، کیونکہ امی کہتی تھیں۔ ڈاک خانہ والے تمہارا ہر خط کھول کر پڑھ لیتے ہیں اور اکثر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔

اچھا ابا! سب سے پہلے یہ بتاؤ، کیا مجھے ان ڈاک خانے والوں پر غصہ نہیں آتا چاہیئے۔ جہلا تم نے ان کا کیا بگاڑا ہے جو تمہارا خطرہ رکھ لیتے ہیں۔ کسی کا خط کھول کر پڑھ لینا کتنی بُری بات ہے۔ کیا ڈاک خانہ کے بالبوؤں کو بُری اور اچھی باتوں کی بھی سمجھ نہیں؟ میرا خیال ہے کہ سکول کی کتابوں میں تو انھوں نے ضرور پڑھا ہو گا کہ اچھی بات کو سنی ہوتی ہے اور بُری کو سنی، پھر وہ سکول کا پڑھا ہوا بھول کیوں گئے ہیں؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسکول میں پڑھی ہوئی اچھی اور بُری باتیں اور ہوتی ہوں اور سکول سے باہر کی اچھی اور بُری باتیں اور؟ — جب تم جواب لکھو تو میرا یہ شک ضرور دور کر دینا۔ ایک بار میں نے اپنے ماسٹر جی سے بھی یہی سوال کیا تھا تو انھوں نے مجھے جھڑک دیا تھا اور کہا تھا کہ تمہارے ابا نے تمہارا دماغ بگاڑ دیا ہے جو ایسی اُلٹی پلٹی باتیں سوچتا ہے۔

ایا! اگر تم بھی واقعی الٹی پٹی باتیں سوچتے ہو۔ تو بہت برا کرتے ہو۔ دیکھو! اس سے تمہارا دماغ بگڑ گیا ہے، ماسٹر جی کہتے تھے جب کسی کا دماغ بگڑ جاتا ہے تو وہ خود بھی دکھی رہتا ہے اور سارے خاندان کو بھی دکھی بنا دیتا ہے اور ایا! اگر تم ناراض نہ ہو جاؤ، تو کہہ دوں کہ ہمارا سارا گھر واقعی دکھی ہے اور تم بھی تو کتنے دکھی ہو۔ اب دیکھو تم مجھ سے دُور، امی سے دور، موشی سے دور — رہ رہے ہو۔ کیا تمہیں ہم سے دور رہ کر دکھ نہیں ہوتا۔ ضرور ہوتا ہوگا۔ اُمی تو یونہی مجھے بہلانے کے لئے کہتی ہوگی کہ تم کہیں نہیں روئے۔ تمہارا کچھ پتھر کا ہے۔ تمہاری آنکھیں خشک لکڑی کی طرح ہیں اور ان میں ایک آنسو تک نہیں آتا لیکن میں امی کے جھوٹ اچھی طرح جانتا ہوں۔ جب کہ میں تمہارے بغیر کئی بار رونے لگ جاتا ہوں، اُمی ہولے ہولے سسکیاں بھرنے لگتی ہیں۔ سو شئی رات کو ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی ہے اور چیخنے لگتی ہے، تو کیا تم ہمارے لئے ایک آنسو تک نہیں بہا سکتے ہو گے۔ میں جانتا ہوں کہ تمہارا دل اتنا کھوڑ نہیں ہو سکتا۔ کھوڑا دل واسے تو کسی سے پیار تک نہیں کرتے۔ لیکن جب تم یہاں ہوتے ہو تو ہمیں کتنا پیار کرتے ہو، گدگدیاں کر کے مجھے لوٹ پوٹ کر دیا کرتے ہو — جہاں اب تم بستے ہو۔ وہاں تم کو گدگدیاں کروانے والا بھی کوئی نہیں ملتا ہو گا۔ اُمی کہتی تھیں، اب تم سیلے کچیلے مزدوروں اور گندے گندے کسانوں اور اسی قسم کے گھٹیا آدمیوں سے پیار کرتے ہو۔ میں کہتا ہوں ابا! تمہیں کیا مزا آتا ہوگا۔ ان سے پیار کرنے میں اور پھر سنا ہے کہ ایسے لوگوں کو پیار کرنے سے بڑے بڑے افسر لوگ تم سے ناراض بھی ہو جاتے ہیں۔ جانے تم ان افسروں سے کیوں نہیں ڈرتے، میں تو

بڑا ڈرتا ہوں نہ ان سے ہمارے اسکول میں جب بھی گولی بڑا افسر آتا ہے۔ تو میری تو مار سے خوف کے گھٹکی بندھ جاتی ہے۔ اور بولا تک نہیں جاتا۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر کوئی ایسی ویسی بات میرے منہ سے نکل گئی تو کہیں یہ صاحب بے ہنٹری نہ مار دیں۔ تھانے ہی میں نہ لے جائیں۔ میرا کہا: "نو تو پیارے بابا! ان افسروں کی دشمنی سول نہ لو۔ ورنہ وہ تھیں ہنٹ مارنے لگیں گے۔ اور اگر خدا نخواستہ تھیں تھانے لے گئے تو..... تو..... اُف! یہ تھانے والے بڑے ظالم ہوتے ہیں۔ ہمارے پڑوسی جمہ کھمار کی تو ایک بار تھانے والوں نے چمڑی اڈھیڑ دی تھی۔ بیچارہ لہو میں لت پت ہو کر آگیا تھا۔

تھیں سمجھاتے ہوئے بھی تو بے ڈر لگتا ہے۔ سوچتا ہوں، کہیں تم یہ سمجھنے لگو کہ میں پانچ چھ جماعتیں پڑھ کر بڑا گستاخ ہو گیا ہوں۔ بابا! تم تو خود اتنے عقلمند ہو۔ اتنی کھیتی تھیں تھانے بابا بہت بڑے آدمی ہیں۔ بہت بڑے شاعر ہیں۔ بہت بڑے ادیب ہیں۔ اور ملک بھر میں ان کی نظموں اور کہانیوں کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ سچ پچا بابا! جب میں اتنی کی یہ بات سنتا ہوں تو خوشی سے میرے بدن میں کچھ ہوسا جاتا ہے۔ اور میں اپنے دوستوں میں بیوٹہ کر بڑے فخر سے کہا کرتا ہوں کہ میں بہت بڑے آدمی کا بیٹا ہوں۔ لیکن بابا! میری اس بات سے وہ ہنواری سیٹھ کا لڑکا گر دھاری اور ڈپٹی صاحب کا لڑکا مادھو بہت جھلنے ہیں۔ اور اس راجھی بھگت کا نوڈا اثر راجھی بھی کہتے ہیں کہ تھانے بابا کو تو سرکار چاہے خرید لے، چاہے جیل میں ڈال دے۔ وہ نہ تو خدا کو مانتا ہے

نہ سرکار کو۔ سچ آبا کیا تم ہرکار اور خدا کو واقعی نہیں مانتے۔ مادھو کہتا تھا جو آدمی خدا اور سرکار کو نہیں مانتا وہ نہ تو بڑا آدمی بن سکتا ہے اور نہ پیٹ بھر روٹی کھا سکتا ہے۔ پیٹ بھر روٹی والی بات تو شاید اس نوٹڈے مادھو کی سچی بھی ہے کیونکہ میں نے اور اقی نے اور سوشی نے کئی بار روٹی نہیں کھائی آٹا ہی نہیں ملتا تھا۔ آبا! لیکن بڑے آدمی تو تم ہو! تمہاری اتنی کتابیں ہیں کتنی اچھی اچھی نظمیں لکھتے ہو تم، کتنے ہی رسالوں میں تمہاری کہانیاں چھپتی ہیں کئی رسالوں میں تو تمہاری تصویریں بھی چھپتی ہیں۔ ہمارے گھر کتنے ہی ایسے دسائے آتے ہیں۔ جب تم آؤ گے تو میں تمہیں سب دکھاؤں گا۔ میں نے سوشی سے چپا کر ادا ری کے پیچھے رکھ چھوڑے ہیں۔

اچھا آبا ایک بات بتاؤ۔ تم اتنی اچھی اور بڑی نظمیں اور کہانیاں جو لکھتے ہو۔ کبھی تم نے ایسی نظم بھی لکھی جیسی ہماری کتاب میں ہے۔

تری شانِ جلِ جلالہ

تو ہے سب کا رازِ ق و رہنما تری شانِ جلِ جلالہ،
 کتنی اچھی نظم ہے۔ یہ آبا! ہم نے جب اسکول میں مل کر گائی تھی، تو صاحب بڑا خوش ہوا تھا۔ یہ صاحب ایسی نظموں سے بہت خوش ہو جاتے ہیں، تم بھی ایسا لکھو نہیں کرتے کہ جو افسر تم سے ذرا ناراض ہو، بس اسے ایسی نظم لکھ کر سنا دو۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہ خوش بھی ہو جائیگا اور تمہیں شاید انعام بھی دے گا۔ ہمیں تو خوش ہو کر اس نے اچھے اچھے کھلونے انعام میں دیئے تھے۔ ہمارا ماسٹر کہتا تھا کہ تمہارا آبا ایسی نظمیں لکھ

ہی نہیں سکتا۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اے آبا! اگر تم کوئی ایسی منظم لکھ کر بھیج دو تو میں اس ماسٹر کو شرمندہ تو کر دوں گا۔

پرسوں چچا ملہو ترہ آئے تھے۔ کہتے تھے، تمھارے ابا پندرہ دن تک فاقے کرتے رہے اور پھر تنگ آ کر سرکار کے ایک رسالے میں نوکری کر لی۔ ابا! بس مجھے تم سے یہ بڑی شکایت ہے۔ تمہیں آخر کیا غم تھا کہ اتنے دن فاقے کرتے رہے۔ فاقے کرنے سے بدن کمزور ہو جاتا ہے۔ دماغ کام نہیں کرتا ہونٹ سوکھ جاتے ہیں۔ اتنے بڑے عقل والے ہو کر کبھی کبھی تو تم ایسی باتیں کرنے لگتے ہو جن سے مجھے بھی خواہ مخواہ غصہ آ جاتا ہے۔ بھلا فاقہ کرنے میں کیا مزا آتا ہے تمہیں! اور تو اور اتنی بھی پچھلے دنوں کچھ فاقے کر چکی ہیں۔ کہتی تھیں۔ تمھارے ابا نہیں آئے اس لئے ان کی یاد میں فاقے کرتی ہوں۔ جھوٹی کہیں کی۔ جیسے میں جانتا ہی نہیں تھا کہ وہ فاقے کیوں کرتی تھیں۔ چچا ملہو ترہ اگر گندم کی بوری نہ بھجوا دیتے تو وہ اب بھی فاقے کر رہی ہوتی۔ سچ پوچھو ابا! میں تو اس فاقے کے سخت خلاف ہوں۔ میں تو ہمیشہ انی سے لڑ پڑتا ہوں کہ میں بالکل فاقے نہیں کر دوں گا۔ چنانچہ کھانے کے وقت میں چوری پھپھے بھاگ کر جمعہ کہہ مار کے گھر چلا جاتا ہوں اور وہ مجھے ساگ اور چنوں کی گرم گرم روٹی کھلا دیا کرتا ہے ابا! یہ جمعہ کہہ مار تھیں بہت یاد کرتا ہے۔ کہتا تھا تمھارا ابا آدمی نہیں دیتا ہے دیوتا۔ سرکار کے خلاف ایسی ایسی زوردار باتیں لکھتا ہے کہ سب عیش عشق کر اٹھتے ہیں۔ جمعہ کہہ مار کی یہ بات مجھے ابھی تو لگتی ہے مگر سرکار کے خلاف ایسی بات سیری سمجھ میں نہیں آتی۔ جمعہ بھی سرکار کو کوستا ہے، چچا ملہو ترہ بھی

کو سنا ہے، پھو ریلواری بھی کو سنا ہے۔ اور تم بھی کو سیتے ہو، کیا سرکار ایسی ہی بُری ہے کہ اسے ضرور کو سنا پڑتا ہے۔

لیکن خیر، یہ اچھا ہوا، کہ تم نے سرکار کی نوکری کر لی۔ اب تو تم اسے نہیں کو سو گئے نا؟ آبا! میرے پیارے آبا! پر ماتما کے لئے تم سرکار کو مت کو سا کرو ورنہ میں ڈر رہا ہوں کہ کہیں ہمیں وہ مکان سے نہ نکال دے، وہ بڑی بڑی بوچھڑ والے ایک انسپکٹر ایک دن ہمارے گھر آیا تھا کہتا تھا سرکار کا حکم ہے کہ مکان خالی کر دو، کیونکہ تمہارا آبا سرکار کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا پھرتا ہے۔ ہائے آبا! اگر ہمیں مکان سے نکال دیا اس نے تو ہم کہاں رہیں گے؟ کہاں سوئیں گے؟ رات کو کتنی سخت سردی ہوتی ہے، میرے اچھے آبا! بس میری یہ بات مان لو کہ لوگوں کو مت بھڑکایا کرو۔

لیکن ایک بات میرے دل میں ابھی تک کھٹک رہی ہے، چچا ملہوترہ کہتے تھے کہ تم یہ نوکری کبھی نہیں کر سکو گے اور پاگل ہو جاؤ گے۔ آخر کیوں؟ آخر کیوں؟ اور تو اور یہ جمجہ کمہار بھی کہتا تھا کہ تمہارے بابو جی یہ نوکری کبھی نہیں کریں گے۔ میرا خیال ہے آبا! یہ جمجہ کمہار اور ملہوترہ ہی تمہیں کوئی پٹی پڑھاتے ہوں گے۔ ورنہ نوکری نہ کرنے کی کیا وجہ ہے۔ کیا جب تم نوکری کر لو گے، تو جمجہ کمہار کو بھول جاؤ گے۔ چچا ملہوترہ کو بھی، پھو ریلواری کو بھی، یہ سب ایسا ہی کہتے تھے میں انہیں لاکھ سمجھاتا رہا کہ بابا! وہ کبھی نہیں بھولیں گے تمہیں۔ اتنا پیار کرتے ہیں وہ تم لوگوں سے، مگر نہ جانے انہیں کیا شبہ پڑ گیا ہے کہ میری بات پر توجہ ہی نہیں دیتے۔ میں سوچتا ہوں تمہاری نوکری لگ جائے گی، تو تم پھر

پھر خیال آیا کہ صاف صاف کہہ ہی دوں اسے۔ اب بھلا کا ہے کا ڈر ہے اس سے۔ امی بھی تو کہا کرتی تھیں کہ جب تمہارے آبا نوکری کر لیں گے، تو یہ لال لال آنکھوں والا آنا بند کر دے گا۔ چنانچہ میں نے اسے چھاتی تان کر کہہ دیا تھا کہ بھائی صاحب! اب تم آنا بند کر دو۔ کیونکہ میرے آبا سرکار کی نوکری کر رہے ہیں۔ اس پر آبا! — اس بیچائے کا چہرہ بالکل پیلا پڑ گیا تھا۔ پھر کہنے لگا۔ بڑے چالاک ہو اپنے باپ کی طرح تمہارا باپ سرکار کی نوکری کبھی کر ہی نہیں سکتا۔ چاہے بھوکوں مر جائے۔ مجھے اس کی بات پر بڑا غصہ آیا۔ جی تو چاہا، اسے کہہ دوں، ہم کیوں بھوکوں مر رہے گے جی، کیا میرا باپ تمہاری طرح کوئی جاہل ہے۔ جو نوکری نہیں کر سکے گا۔ سرکار تو اس کی منین کرتی پھرتی ہے۔ مگر میں کہہ نہ سکا۔ اور بھاگ آیا۔ اور جمعہ کہہ ہار کے گھر گھس گیا۔ آبا! اب تم یہاں حکم بھیج دو کہ اب وہ لال لال آنکھوں والا تمہارے متعلق ایسی باتیں نہ کیا کرے۔ ہو گا کوئی اے، بی، سی، ڈی والا۔ ہم کوئی اس کا دیا کھاتے ہیں۔ میں نے تو وہ سٹھائی بھی نالی میں پھینک دی تھی جو اس نے مجھے لیکر دی تھی۔

آبا! میں تمہیں باتیں تو بہت سی بتانا چاہتا تھا۔ لیکن اب مجھے منید آرہی ہے۔ جاتے جاتے تمہیں جمعہ کہہ ہار کی ایک اور بات بتا دوں، آج شام کو اجی سے کہہ رہا تھا۔ رانی بیٹیا! نگیش بابو اب سرکار کے لئے لکھیں گے تو کیا خاک لکھیں گے۔ بس افیون ہوگی افیون، جسے پی کر سب کو نیند آ جائیگی

فکر ہی کا ہے کو کرتے ہیں۔ ڈال دے سرکار انھیں جیل میں۔ تو کیا میں مر گیا ہوں۔ میں دن رات کام کر کے بھی تمھیں اور ننھے کو کھلاؤں گارانی! میرے گھر کی کی روٹیاں اور ساگ تو ہے۔ ٹوٹا پھوٹا مکان تو ہے۔ سوٹا گھر در کپڑا تو ہے۔ تو یہی سہی۔

اسی طرح ابا! جمعہ بڑے جوش میں آیا ہوا تھا۔ اور بڑی دیر تک کتنی ہی بڑی بڑی لمبی چوڑی باتیں کرتا رہا۔ جیسے امی کو لیکر دے رہا ہو اور امی سر جھکائے دھیرے دھیرے روتی رہی تھی۔ اور مجھے جمعہ پر بڑا غصہ آتا رہا تھا۔ منہ! میری پیاری امی کو رُلا رہا تھا۔ تمھیں، جھوٹا، دھوکہ باز اور سرکار کہہ رہا تھا۔ بڑا آیا سچا کہیں کا۔ اور ایک بار تو ابا! بولتے بولتے اتنا تیز ہو گیا تھا کہ میرے سر ہانے رکھے ہوئے رسالے اور تمھاری کتابیں اٹھالایا تھا۔ اور کہنے لگا۔۔۔۔۔ آگ میں جھونک دو انہیں۔ ان نظموں کو ان کہانیوں کو۔ نگیش بابو نے ہمارے لئے لکھی تھیں۔ ہماری بھوک سٹانے کے لئے لکھی تھیں۔ اور جنھیں سرکار نے ضبط بھی کر لیا تھا۔ اب یہ ہمارے کس کام کی۔ جب ان کا لکھنے والا ہی ہمارا نہ رہا۔ تو ہم انھیں پڑھ کر کیا کریں۔

اُف! کتنا خوفناک اور ڈراؤنا چہرہ ہو گیا تھا جمعہ کا۔ یہ جمعہ ہمارا کیا لگتا ہے آبا۔ ہمارے گھر میں آکر ہمیں گالیاں سُنا تا رہتا ہے۔ اگر پھر کبھی آیا تو میں دروازہ بند کر دوں گا۔ اور اسے اندر بھی نہیں گھسنے دوں گا۔

میں نے شام کو کھانا کھاتے کھاتے امی سے بھی پوچھا تھا کہ یہ جمعہ ہمارا کیا لگتا ہے ؟ مگر اتنی تو بس رونے کے سوا کچھ جانتی ہی نہیں ۔ یا زیادہ سے زیادہ مجھے گلے سے چمٹا کر میرا ہاتھ زور زور سے چومنے لگتی ہے ۔ کہتی تھی جمعہ سچ کہتا ہے بیٹے ! سرکار کے ہاتھ میں دھن ہے اور تمہارے ابا کو ہمارے لئے دھن کی ضرورت ۔ لیکن جمعہ کو تمہارے بابو جی کی منٹوں کی ضرورت ہے ۔ اور سرکار تمہارے ابا کو ایسی منٹیں لکھنے ہی نہیں دیتی ۔ جو وہ جمعہ کے لئے لکھتا ہو پھر وہ کیا کرے ، جمعہ کیا کرے ۔ مجھے اتنی کہتی تھی کہ تم بھی اپنے ابا کو ایک زوردار خط لکھو کہ وہ ہمارے فکر نہ کریں ۔ میں جکی پس کر ، میں مشین چلا کر اپنا پیٹ بھروں گی ۔ وہ سرکار کے لئے منٹیں ست لکھیں ۔ بیٹا ! تمہارے ابا سرکار کے لئے منٹیں لکھیں گے تو وہ ضرور پاگل ہو جائیں گے ، ان کا دماغ بھٹ جائے گا ۔ وہ بیمار ہو جائیں گے ۔ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ وہ کچھ بھی نہ لکھیں اور کوئی بان سگریٹ کی دوکان کھول لیں ۔

ابا ! امی کی باتیں مجھے زہر کی طرح لگیں اور میں نے روٹی کھانا بھی چھوڑ دی ۔ اور اٹھ کر باہر بھاگ گیا ۔ اُف ! میں کیا کیا سپنے دیکھا کرتا تھا کہ تم نوکری کرو گے تو میں بھی مادھو اور گر دھاری کی طرح عیش اڑایا کروں گا ۔ ایک ننھی سی سائیکل خریدوں گا ۔ ننھے ننھے کپڑے سلواؤں گا ۔ اچھا کھانا بھی ملے گا ۔ مگر یہ جمعہ اور یہ امی ! ان کا تو دماغ خراب ہو گیا ہے ۔ میری مانو تو ابّا تم نوکری ضرور کر لو ۔ آخر حرج ہی کیا ہے ۔ تم سرکار کے لئے بھی لکھا کرو اور کبھی کبھی جمعہ کے لئے بھی منٹیں لکھ دیا کرو ۔ یہ چالاکی مجھے ابھی ابھی سوجھی

ہے۔ اسید ہے کہ تم بھی سیری اس دانائی کی داد دو گے۔

اچھا! اب میں سونے لگا ہوں ————— ہاں کل تمھارے نام

ایک بڑا سلفافہ آیا تھا۔ تمھاری کوئی کہانی تھی۔ شاید ریڈیو والوں
نے واپس کر دی ہے۔ لکھا تھا کہ ہم یہ کہانی نہیں خرید سکتے۔ کیونکہ یہ سرکار
کی پالیسی کے خلاف ہے۔ میں وہ سلفافہ بھی تمھیں بھیج رہا ہوں۔

تمھارا پیارا بیٹا

رانا کوشل کا منی

سویمل

خاص نمبر

کمرشن چندہ

لکشمی کا پل

مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار لکشمی جی کا ایک مندر ہے اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے ہیں۔ اس مندر میں پوجا کرنے والے ہارتے زیادہ ہیں۔ جیتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے۔ جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متقن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دھلتی ہے اور بدرو میں انسان کے جسم کی غلاظت، اور ان دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پل ہے۔

مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہا رہی ہیں۔ پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑھیاں لہاتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ ہر روز ان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کے لئے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے اس پار جاتے ہوئے لوگ مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظام کرتے ہوئے لوگ گاڑی کی کھڑکیوں اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ، اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں، وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں، بھورا گہرا بھورا۔ مٹ میلا نیلا۔ قرمزی بھورا۔ گندا سرخ کنارہ۔ گہرا نیلا اور لال، وہ لوگ

اکثر انھیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں، ایک لمحے کے لئے۔ دوسرے لمحے میں گھاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذبِ نظر نہیں رہے۔ کسی زمانے میں ممکن ہے جب یہ نئی خریدی گئی ہوں ان کے رنگ خوبصورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ مگر اب نہیں ہیں۔ دھوئے جلنے سے ان کی آب و تاب مرچکی ہے۔ اور اب یہ ساڑھیاں، اپنے پھیکے سیٹھے روزمرہ کے انداز کو لئے بڑی بے دلی سے جھگے پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انھیں سو بار دیکھئے یہ آپ کبھی خوبصورت دکھائی نہ دیں گی۔ نہ ان کا رنگ روپ اچھا ہے، نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی، گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھوئے جلنے سے ان کا کپڑا بھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزِ دن بھی نظر آتے ہیں۔ کہیں اُدھڑے ہوئے ٹانگے ہیں کہیں بدنما چتے داغ جو اس قدر پائدار ہیں کہ دھوئے جلنے سے بھی نہیں دھلتے بلکہ اور گہرے ہو جاتے ہیں۔

ہیں ان ساڑھیوں کی زندگی سے واقف ہوں۔ کیوں کہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہالکشمی کے پل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چال متوالی نہیں ہے، بڑی غریب سی چال ہے۔ میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں۔ اس لئے آپ کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں۔ ابھی وزیرِ اعظم کی گھاڑی آنے میں بہت دیر ہے۔ آپ انتظار کرتے کرتے اکتا جائیں گے۔ اس لئے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سُن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔

ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑھی لٹک رہی ہے یہ شاننا بائی کی ساڑھی ہے۔ اس کے قریب جو ساڑھی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی۔ مگر

وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے۔ آپ نہیں میں اس کا بھورارنگ دیکھ سکتا ہوں، کیونکہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑھی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے جیسا شاننا بائی کی ساڑھی کا، اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کر سکیں گے ہیں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں۔ مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے وہ شاننا بائی کی ساڑھی ہے اور جو دوسری بھورے رنگ کی ساڑھی ہے اور جس کا گہرا بھورارنگ صرف سیری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیون بائی کی ساڑھی ہے۔

شاننا بائی کی زندگی بھی اس کی ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے۔ شاننا بائی برتن منجے کا کام کرتی ہے اس کے تین بچے ہیں۔ ایک بڑی لڑکی ہے۔ دو چھوٹے لڑکے ہیں۔ بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی۔ سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے۔ شاننا بائی کا خاوند سیونل میں کپڑا کھاتہ میں کام کرتا ہے اسے بہت جلد جانا ہوتا ہے اس لئے شاننا بائی اپنے خاوند کے لئے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکاکے رکھتی ہے، کیونکہ اسے صبح خود برتن صاف کرنے کے لئے اور پانی ڈھونڈنے کے لئے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا ہے اور اب وہ ساتھ میں اپنی چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے۔ اور دوپہر کے قریب واپس چال میں آتی ہے۔ واپس آکے وہ نہاتی ہے اور اپنی ساڑھی دھوتی ہے اور سکھانے کے لئے پٹل کے جھنگے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک بے حد غلیظ اور پرائی دھوتی پہن کر کھانے پکانے میں لگ جاتی ہے۔ شاننا بائی کے گھر چو لھا اسی وقت سلگ سکتا ہے جب دوسروں کے ہاں چوٹے ٹھنڈے ہو جائیں۔ یعنی دوپہر کو دبیچ

اور رات کو فوجے۔ ان اوقات کے ادھر اور ادھر اسے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجنے اور پانی ڈھونڈنے کا کام کرنا ہوتا ہے۔ اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے شانتا بائی برتن صاف کرتی ہے۔ چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے۔ دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اس کے گال سرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ لیتا ہوں کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں اس دن شانتا بھی سیری نشتے کا جواب نہیں دیتی۔ جلتی بھنتی بڑبڑاتی چولہا سلگنے میں مصروف ہو جاتی ہے اور چولہے میں آگ کم اور دھواں زیادہ نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھویں سے اپنا دم گھٹا دیکھ کر چیختا ہے۔ یوں تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا ہے اور اسے اکثر بھوک لگی رہتی ہے اور دو سال ہی کی عمر میں اسے باجرے کی روٹی کھانی پڑتی ہے۔ اسے اپنی ماں کا دودھ دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے پھر یہ بھی خشک باجرے اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی غوراک پر پلے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گڈڑی اور ڈھکڑھکڑا جاتے ہیں۔ سوتے میں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جاگتے میں بھی بھوکے رہتے ہیں اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجرہ اور ٹھنڈا پانی پی کر کام کرتے جاتے ہیں اور ان کی بھوک ٹھمتی جاتی ہے اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں اور جب پیگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانہ کا مریخ کرتے ہیں تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لئے یہ دھمک ناکل ہو جاتی ہے لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی نہیں پی سکتا۔ ایک دن بچے گا دو دن بچے گا۔ تیسرے دن کی

تاڑی کے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے۔ راشن کا خرچہ ہے بھاجی ترکاری ہے، تیل اور رنگ ہے، بجلی اور پانی ہے اور شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے جو چھپے ساتویں تار تار ہو جاتی ہے۔ جیسی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھدی نکلی ساڑھی دیتے ہیں ان کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے جوڑ کے گانٹھ کے ٹانگے لٹکے کام دیتا ہے اور پھر وہی چار روپے پانچ آنے خرچ کرنے پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آ جاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت پسند ہے اس لئے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے۔ اسے گھروں میں بھاڑ دینا ہوتی ہے۔ برتن صاف کرنا ہوتے ہیں۔ تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا ہوتا ہے وہ بھورا رنگ پسند نہیں کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی۔ ادھندہ اتنی بے وقوف نہیں ہے۔ وہ نین پچوں کی ماں ہے۔

لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے۔ پہنے تھے۔ انھیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا۔ جب وہ دھارا دار میں اپنے گاؤں میں تھی۔ جب اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی۔ جہاں سیلوں اس نے شوخ رنگ ناچے ہوئے دیکھے تھے۔ جہاں اس کے باپ کے دھان کے کھیت تھے، ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت۔ اور آنگن میں پیر کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ پیر توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی۔ جانے اب پیروں میں وہ مزا ہی نہیں ہے۔ وہ شیرینی اور گھلا دھڑ ہی نہیں ہے۔ وہ رنگ وہ چمک دمک جانے کہاں جا کے مر گئی۔ وہ سارے رنگ کیوں بکھجت بھورے ہو گئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجھتے مانجھتے، کھانا پکاتے، اپنی

ساڑھی دھوئے، اسے پل کے جنگلے پر لا کر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹری پر بہتے جاتے ہیں اور دور سے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بد صورت عورت کو پل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑھی کو پھیلانے دیکھتے ہیں اور بس دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گزر جاتی ہے۔

جیونا بائی کی ساڑھی جو شاننا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے گہرے بھورے رنگ کی ہے بظاہر اس کا رنگ شاننا بائی کی ساڑھی سے پھیکا نظر آئے گا لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ ساڑھی بھی پانچ روپے چار آنے کی ہے اور بڑی ہی بد سیدہ ہے۔ دو لک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانگے لگ گئے ہیں اور اتنی دور سے معلوم بھی نہیں ہوتے۔ ہاں آپ وہ بڑا کھڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی لگا یا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس سے پہلی ساڑھی کا ہے اور دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے اس لئے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ سوچا کرتی ہے۔ پرانی یادوں سے (نئی) یادوں کی تمنیوں کو بھول جانے کی کوشش کیا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے اس غاوند کے لئے روتی رہتی ہے جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی آنکھ کافی کر ڈالی تھی۔ وہ اس لئے نشے میں تھا کہ وہ اس روزیل سے نکالا گیا تھا۔ بڑھا ڈھونڈو۔ اب میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گودہ بہت تجربہ کار تھا لیکن اس نے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا۔ بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہنے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پیٹھروں

میں جل کے ایسے دھنس گئے تھے جیسے چرخیوں اور اینٹوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے ٹہمیں
 تائے پھنس کر لگ جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اسے دے میں مبتلا
 کر دیتے اور جب برسات نہ ہوتی تو دن بھر اور رات بھر کھانسی ایک خشک مسلسل کھنکار گھر میں
 اور کارخانہ میں جہاں وہ کام کرتا تھا، سنائی دیتی رہتی۔ مل کے مالک نے اس
 کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سننا اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈو اس کے چچا
 بعد مر گیا۔ جیونا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیا ہوا اگر غصے میں آ کے ایک دن
 اس نے جیونا بائی کی ہیکھ بھال دی۔ تیس سال کی ازدواجی زندگی ایک لمحے پر قربان نہیں
 کی جاسکتی۔ اور اس کا غصہ بجا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈ ڈھونڈ کر بے تصور نوکری سے الگ
 نہ کرتا تو کیا جیونا کی ہیکھ بھال سکتی تھی۔ ڈھونڈو ایسا نہ تھا اسے اپنی بے کاری کا غم تھا۔ اپنی پینتیس
 سالہ ملازمت سے ہر طرف ہونے لگا رہا تھا اور سب سے بڑا رنج اسے اس بات کا تھا کہ
 مل مالک نے اسے چلتے وقت ایک دھیلہ بھی نہ دیا۔

پینتیس سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ
 واپس لوٹا اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آئے پر اسے ایک
 دھچکا سا لگا۔ باہر آکر اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان پینتیس سالوں میں کسی نے اس کا سارا
 رنگ، اس کا سارا خون، اس کا سارا دس چوس لیا ہو اور اسے بے کار سمجھ کر باہر کوڑے
 کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا ہو اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اسٹری
 چینی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔
 بچا ایک ڈھونڈو نے غم اور غصے سے اپنے ہاتھ ملے۔ زمین پر زور سے تھوکا اور پھر
 تازی خانہ میں چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ پھر بھی نہ جاتی اگر اس کے پاس علاج کے لئے پیسے ہوتے وہ آنکھ تو گل گل کر سٹریٹر کر خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں اور کمپنڈروں اور نرسوں کی مدد احتیاطیوں، نگالیوں اور لاپرواہیوں کا شکار ہو گئی اور جب جیونا اچھی ہوئی تو ڈھونڈو بیمار ہو گیا اور ایسا بیمار ہوا کہ پھر ستر سے نہ اٹھ سکا۔ ان دنوں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن منجنے کا کام دلوا دیا تھا اور گو وہ اب بوڑھی ہو گئی تھی اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں جھوٹی طاقت کے بودے سہاے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی نگالیاں سنتی رہی اور کام کرتی رہی کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔

لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا اور اب جیونا بائی اکیلی تھی خیریت اسی میں تھی کہ وہ بالکل اکیلی تھی اور اب اسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بد معاش کے ساتھ بھاگ گئی اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا یا سئی کی بیٹی فارس روڈ پر چمکیلا، بھرکیلا ریشمی لباس پہنے بیٹھی ہے۔ لیکن جیونا کو یقین نہ آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوٹی پہنے بسر کر دی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ اس کا اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ وہ کبھی فادس روڈ نہیں گئی کیوں کہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے

والی دھوٹی تھی۔ باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی عزت تھی۔ یہ سب چھوڑ کے
 فارس روڈ کیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بد معاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کر
 لے گیا تھا۔ کیونکہ عورت محبت کے لئے سب کچھ کر گزرتی ہے۔ خود وہ تیس سال پہلے
 اپنے ڈھونڈو کے لئے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کے نہیں چلی آئی تھی۔ ہاں جس دن ڈھونڈو
 مرا اور جب لوگ اس کی لاش جلاتے کے لئے لے جانے لگے اور جیونانے اپنی سینڈ
 کی ڈبیا اپنی بیٹی کی انگیا پر انڈیل دی جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے
 چھپا کر رکھی تھی۔ عین اسی وقت ایک گد رائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس
 پہنے اس سے آگے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی اور اسے دیکھ کر جیونانہ کو یقین
 ہو گیا کہ جیسے اس کا سب کچھ مر گیا ہے۔ اس کا پتی اس کی بیٹی، اس کی عزت۔ جیسے وہ زندگی بھر
 روٹی نہیں غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ شروع ہی سے کچھ
 نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اسے نہتا، ننگا اور
 بے عزت کر دیا گیا تھا اور جیونانہ کو اسی لمحے میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں زندگی بھر اس کا
 خاوند کام کرتا رہا اور وہ جگہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہو گئی اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی دکھا
 سجا کے بیٹھ گئی ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ ہے جس میں کوئی ظالم جابر ہاتھ انسانی جسموں کو
 لے کے گئے کارس بکھانے والی چرخ میں ٹھونست جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ
 کر دوسری طرف پھینکت جاتا ہے اور یکایک جیونانہ اپنی بیٹی کو دھکا دے کر الگ کھڑی
 ہو گئی اور چغیں مار مار کر روئے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے۔ یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے۔ اور

ٹیلا لایا بھی ہے۔ کچھ ایسا عجیب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا بلکہ اور غلیظ ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔ میں فورٹ میں دھنوبھائی کی فرم میں کلر کی کرتا ہوں مجھے پینسٹھ روپے تنخواہ ملتی ہے۔ سیون مل اور بکریا مل کے مزدوروں کو یہی تنخواہ ملتی ہے اس لئے میں بھی انھیں کے ساتھ آٹھ نمبر کی چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں۔ مگر میں مزدور نہیں ہوں کلرک ہوں۔ میں فورٹ میں نوکر ہوں، میں دسویں پاس ہوں۔ میں ٹائپ کر سکتا ہوں۔ میں انگریزی میں عرضی لکھ سکتا ہوں۔ میں اپنے وزیرِ عظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔ آج ان کی گاڑی تھوڑی دیر میں مہالکشی پر آئے گی نہیں وہ ریس کو ریس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے۔ ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا۔ میری بیوی کو اپنے وزیرِ عظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے۔ مگر میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتا کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت ایک پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو توئی کوئی چیز کم ہو جاتی ہے۔ راشن نوڈوز کم پڑ جاتا ہے۔ اب تل میں پانی بھی کم آتا ہے۔ رات کو سونے کے لئے جگہ بھی کم پڑتی ہے اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینے میں صرف پندرہ دن ملتی ہے باقی پندرہ دن سود خوار پٹھان چلاتا ہے اور وہ بھی کیسے گا لیاں بچے جھکے، ٹھسٹ ٹھسٹ کسی سست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں۔ مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس ان کی فیس کے پیسے بھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا اور سادتری کو اپنے گھر یعنی اس کھولی میں لایا تھا تو میں نے بہت کچھ سوچا تھا ان دنوں سادتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی۔ گو بھی کے نازک نازک ہرے ہرے پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں

جب وہ مسکراتی تھی سینا کی تصویر کی طرح خوبصورت دکھا کرتی تھی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانتی کہاں چلی گئی ہے۔ اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشہ شرم شروع کر دیتی ہے اور میں تو کچھ بھی کہوں کیسے بھی کہوں، کتنی ہی بجا جبت سے کہوں وہ تو بس کاٹ کھالے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساد تری کو کیا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں۔ گھر پر بیوی کی گالیاں سہتا ہوں اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید میری بیوی کو ایک نئی سا بھی کی ضرورت ہے۔ شاید اسے ایک نئی ساڑھی ہی نہیں، ایک نئے چہرے، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول، ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے۔ مگر اب ان باتوں کے سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آگئی ہے اور ہمارے وزیر اعظم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساد تری کو اپنے وزیر اعظم کی تقریر جو اخبار میں چھپی تھی سنائی تو وہ اسے سن کر آگ بگولہ ہو گئی اور اس نے غصے میں آ کے چوٹھ کے قریب پڑا ہوا ایک چٹا میرے سر پر دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں اسی کا نشان ہے ساد تری کی مٹ میلی نیلی ساڑھی پر بھی ایسے کئی زخموں کے نشان ہیں مگر آپ انھیں نہیں دیکھ سکیں گے میں دیکھ سکتا ہوں ان میں سے ایک نشان تو اسی مونگیا رنگ کی جارجٹ کی ساڑھی کا ہے جو اس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک بھنجی مل بھوند رام پارچہ فروش کی دوکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اُس کھلونے کا ہے جو بچپن میں روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا تھا۔ لیکن جسے ہم خرید نہ سکے اور جسے نہ پا کر میرا بچہ دن بھر روتا رہا۔ ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا جس میں

سادتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ سادتری جیل پور جانا چاہتی تھی۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود بھی کسی سے مجھے روپے ادھار نہ مل سکے اور سادتری جیل پور نہ جاسکی ایک نشان اس تار کا ہے جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں۔ ان چٹے چٹے گدے گدے غلیظ داغوں سے سادتری کی پانچ روپے چار آنے کی ساڑھی بھری پڑی ہے۔ روز روز دھوئے پر بھی یہ داغ نہیں چھوٹتے اور شاید جب تک یہ زندگی رہے گی یہ داغ یوں ہی رہیں گے۔ ایک ساڑھی سے دوسری ساڑھی میں منتقل ہوتے جائیں گے۔

چوتھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورارنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں کی ساڑھیاں ہیں لیکن بھورارنگ ان سب میں جھلکتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے، جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے، جیسے یہ سب کبھی زمین سے اونچی تھیں اٹھیں، جیسے انھوں نے کبھی شبنم میں نہتی ہوئی دھنک، افق پر چمکتی ہوئی شفق، بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی۔ جیسے جو شاننا بائی کی جوائی ہے وہ جیونا کا بڑھا پا ہے وہ سادتری کا ادھیڑ پن ہے۔ جیسے یہ سب ساڑھیاں، زندگیاں، ایک رنگ، ایک سطح، ایک کتار، ایک تسلسل، یکسانیت لئے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جھببہ جھببہ کی عورت کی ہے۔ اس عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی۔ کیونکہ ایک تو اس کے کوئی بچہ و چہ

نہیں ہے اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہ ہو بڑی محسوس ہوتی ہے اور جادو ٹوٹنے کر کے دوسروں کے بچوں کو مار ڈالتی ہے اور بدردھوں کو ہلا کر اپنے گھر میں بسالیتی ہے۔ سیری بیوی اسے کبھی منہ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبٹو بھیانے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبٹو بھیا مرد باؤ کا رہنے والا ہے۔ لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کر ادھر چلا آیا تھا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے اسی وجہ سے اسے بہت جلد پوار مل کے گٹی کھاتے میں جگہ مل گئی تھی۔ جھبٹو بھیا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا اسے بڑی کا، تارڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو اس بات کا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستر اسی روپے اکٹھے ہو گئے تو اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی تاکہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے مگر پھر اس نے سوچا کہ ان ستر اسی روپیوں میں کیا ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اس نے یہ رقم جوڑی تھی لیکن اس رقم سے وہ مرد آباد ہو سکتا تھا، جا کے شادی نہیں کر سکتا تھا۔ آخر جھبٹو بھیانے یہیں ایک بد معاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سو روپیہ میں خرید لیا۔ اسی روپے اس نے نقد دئے۔ بیس روپے اُدھا میں رہے، جو اس نے ایک سال کے عرصہ میں ادا کر دئے۔ بعد میں جھبٹو کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی۔ دمیرج گاؤں کی اور اس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبٹو بڑا خوش ہوا۔ چلو یہیں بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی جات برادری کی۔ اپنے ضلع کی۔ اپنے دھرم کی عورت یہیں بیٹھے بیٹھے سیر روپے میں مل گئی۔ اس نے بڑے چاؤ چاؤ سے اپنا بیاہ رچایا اور پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی لڑیا بہت اچھا لگاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹا لٹاواڑیں

زور سے گانے بلکہ گانے سے زیادہ چلانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی ہیں دن رات گویا کسی نے ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں لڑیا کام کرتے ہوئے گاتی تھی۔ رات کو جھبوا اور لڑیا دونوں گاتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا اس لئے انھوں نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ میاں مٹھو خاوند اور بیوی کو گاتے دیکھ کر خود بھی لہک لہک کر گانے لگتے۔ لڑیا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبونہ بڑی سپے نہ سگریٹ، تاڑی نہ شراب۔ لڑیا بڑی سگریٹ تاڑی سمی کچھ پیتی تھی۔ کہتی تھی پہلے وہ یہ سب کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر جب سے وہ بد معاشوں کے پلے پڑی اسے یہ سب باتیں سیکھنا پڑیں۔ اور اب وہ اور سب باتیں تو چھوڑ سکتی ہے لیکن بڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی۔ کئی بار تاڑی بی کر لڑیا نے جھبو پر حملہ کیا اور جھبونے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس موقع پر طوطا بہت شور مچاتا تھا۔ وہ رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر خود بھی پیچھے میں ٹنگا ہوا زور زور سے چلانے لگتا۔ لڑیا کو مت مارو مادرجود۔ لڑیا کو مت مارو مادرجود۔ ایک بار تو اس کی گالی سن کر جھبو غصے میں آ کے طوطے کو پیچھے سمیت بد رو میں پھینکنے لگا تھا مگر جھبونے بیچ میں پڑ کے طوطے کو بچا لیا۔ طوطے کو مارنا بڑا پاپ ہے، جھبونے کہا تمہیں پھر براہمنوں کو بلا کے پر انشیت کرنا پڑے گا اور تمہارے پندرہ میں روپے کھل جائیں گے۔ یہ سوچ کر جھبونے طوطے کو بد رو میں غرق کر دینے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو جھبو کو ایسی شادی پہ چاروں طرف سے

گالیاں پڑیں۔ وہ خود بھی لڑیا کو بڑے شہ کی نظروں سے دیکھتا رہا اور کئی بار بلا وجہ اسے پٹیا اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہا۔ مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا۔ لڑیا کہتی تھی کہ کوئی عورت سچے دل سے بد معاشوں کے پتلے پڑنا پسند نہیں کرتی۔ وہ تو ایک گھر چاہتی ہے، چاہے وہ چھوٹا ہی سا گھر ہو۔ وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اس کا اپنا ہو۔ چاہے وہ جھبھو ایسا ہر وقت شور مچانے والا، زبان دراز، شیخی خور ہی کیوں نہ ہو۔ وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بد صورت کیوں نہ ہو۔ اور اب لڑیا کے پاس گھر بھی تھا اور جھبھو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا۔ ہو جائے گا۔ اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی۔ یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا ہے گا۔

ایک روز لڑیا اپنے میاں مٹھو کا پیچرا جھلا رہی تھی اور اسے چوری کھلا رہی تھی اور اپنے دن کے سپنوں میں اس ننھے۔ سے بالک کو دیکھ رہی جو فضا میں ہکتا ہکتا اس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ چال میں شور سا بڑھنے لگا اور اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبھو کو اٹھائے چلے آ رہے ہیں اور ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں۔ لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ بھاگتی بھاگتی نیچے گئی اور اس نے بڑی درشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کے اپنے کندھے پر اٹھا لیا اور اپنی کھولی میں لے آئی۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبھو سے کئی کھلتے کے نیچر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی، اس پر جھبھو نے بھی اسے دو ہاتھ جڑ دئے اس پر بہت دادیلا حجاج اور نیچر نے اپنے بد معاشوں کو ہلا کے جھبھو کی خوب ٹھکائی کی اور اسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبھو بچ گیا ورنہ اس کے مرنے میں

کوئی کسر نہ تھی۔ لڑیا نے بڑی ہمت سے کام لیا۔ اس نے اسی روز سے اپنے سر پہ ٹوٹ کر لی اٹھالی اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی۔ جیسے وہ زندگی میں پہلی دھندلا کر تھی۔ اس طرح محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے جھبہ کو اچھا کر لیا۔ جھبہ بھلا چنگا ہے مگر اب اسے کسی مل میں کام نہیں ملتا۔ وہ دن بھر اپنی کھولی میں گھڑا مہا لکشی کے سٹیشن کے چاروں طرف بلند دبالا کارخانوں کی چمنیوں کو نکتا رہتا، سیون مل۔ نیول۔ لالڈ مل۔ پوار مل۔ دمن راج مل۔ لیکن اس کے لئے کسی مل میں جگہ نہیں ہے۔ کیونکہ مزدور کو گالی کھانے کا حق ہے۔ گالی دینے کا حق نہیں ہے۔ آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دے کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اس نے بڑی تاڑی سب چھوڑ دی ہے۔ اس کی ساڑھی قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹی جا رہی ہے۔ تھوٹے دنوں تک اور اگر جھبہ کو کام نہیں ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑھی پر پُرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے اور اپنے میاں مٹھو کو چوری کھلا تا بند کرنا پڑے گا۔

پانچویں ساڑھی کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔ ساڑھی کا رنگ گدلا سرخ ہے لیکن کنارہ گہرا نیلا ہے اور اس گہرے نیلے رنگ میں اب بھی کہیں کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑھی، دوسری ساڑھیوں سے بڑھیا ہے کیونکہ یہ ساڑھی، پانچ روپے چار آنے کی نہیں ہے۔ اس کا کپڑا اس کی چمک دمک کہے دیتی ہے کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ اس کا کپڑا بہتر ہے اس کا کنارہ چمک دار ہے۔ اس کی قیمت پونے نو روپے ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کی ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے۔ منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں

ہوئے ہیں۔ اس کا خاوند گزشتہ ماہ چرخہ کے گھومتے ہوئے پٹے کی لپیٹ میں آکے مارا گیا تھا۔ اور اب سولہ برس کی خوبصورت منجولا بیوہ ہے۔ اس کا دل جوان ہے۔ اس کا جسم جوان ہے۔ اس کی انگلیں جوان ہیں۔ لیکن وہ اب کچھ نہیں کر سکتی کیونکہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثے میں مر گیا ہے۔ وہ پتہ بڑا ڈھیلّا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار پھٹھٹاتا تھا اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا کیونکہ کام چل رہا تھا اور دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لئے کام بند کرنا پڑتا۔ پٹے کو تبدیل کرنے کے لئے روپیہ بھی خرچ ہوتا تھا۔ مزدور تو کسی دقت بھی تبدیل کیا جاسکتا ہے اس کے لئے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے لیکن پتہ تو بڑی قیمتی شے ہے۔

جب منجولا کا خاوند مارا گیا تو منجولا نے ہر جانے کی درخواست دی جو نامنظور ہوئی کیونکہ منجولا کا خاوند اپنی غفلت سے مرا تھا اس لئے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا۔ اور وہ اپنی نہ ہی نئی دلہن کی ساڑھی پہنے رہی۔ جو اس کے خاوند نے پونے نو روپے میں اس کے لئے خرید کی تھی کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے مرجانے کے بعد بھی دلہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی اور جو ساڑھی تھی وہ بھی گدے سرخ رنگ کی پونے نو روپے کی ساڑھی جس کا کتا گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی ساڑھی پہنے گی۔ اس کا خاوند زندہ رہتا جب بھی وہ دوسری ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی لاتی۔ اس لحاظ سے

اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ مگر فرق اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے، ایک سفید ساڑھی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں بیوہ معلوم ہو سکے۔ یہ ساڑھی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دڑتی ہے۔ اس ساڑھی سے جیسے اس کے مرحوم خاوند کی مضبوط بانہیں لپیٹی ہوئی ہیں جیسے اس کے ہر تار پر اس کے شفاف بوسے مرتسم ہیں۔ جیسے اس کے تالے بانے میں اس کے خاوند کی گرم سانسوں کی حدت آمیز غنودگی ہے۔ اس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے اب یہ ساڑھی نہیں ہے۔ ایک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائیوں کو ہر وقت وہ اپنے جسم کے گرد لپیٹ لینے کے مجبور ہے۔ منجولازندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے۔ لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے کیونکہ اس کی پہننے والی مرچکی ہے۔ پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے۔ سوز کی طرح دھلی دھلائی، ہوا میں جھول رہی ہے۔ یہ مائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی۔ مائی کا ایک بیٹا تھا سیتو۔ وہ اب جیل میں ہے۔ ہاں سیتو کی بیوی اور اس کا لڑکا ہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب پڑے رہتے ہیں۔ سیتو، سیتو کی بیوی ان کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لئے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کے لئے اتنا کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا جتنا ہم لوگوں کو ملتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں۔ وہیں کھانا پکاتے ہیں۔ زمین پر ٹپکے سو رہتے ہیں

یہیں پر بڑھیا مائی بھی ماری گئی تھی۔ وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑھی میں دیکھ رہے ہیں، پتھر کے قریب یہ گولی کا سوراخ ہے۔ یہ کارتوس کی گولی مائی کو بمبئیوں کی ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی۔ نہیں وہ اس ہڑتال میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ وہ بیچارہ تو بہت بوڑھی تھی۔ چل پھر بھی نہیں سکتی تھی اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا سیتو اور دوسرے بھنگی شامل تھے۔ یہ لوگ مہنگائی مانگتے تھے اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے یعنی اپنی زندگی کے لئے در وقت کاررونی کپڑا اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے۔

لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون قرار دیدی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا سیتو آگے آگے تھا اور خوب زور و شور سے نعرے لگاتا تھا۔ پھر جب جلوس بھی خلاف قانون قرار دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی۔ ہم لوگوں نے تو اپنے دروازے بند کر لئے۔ لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا۔ اور پھر ہمیں اپنے کمروں میں ایسا معلوم ہوا گویا گولی ادھر سے ادھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کر دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا اور ہماری چال کے قریب بڑھیا مری پڑی تھی۔ یہ اسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے، جس کا بیٹا سیتو اب جیل میں ہے۔ اس لال ساڑھی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہئے تھا۔ مگر کیا کیا جائے تین ٹھکانا

زیادہ ضروری ہے۔ مردوں کی عزت و احترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ
 زندوں کا تن ڈھکا جائے۔ یہ ساڑھی چلنے چلانے کے لئے نہیں ہے۔ تن ڈھکنے کے
 لئے ہے۔ ہاں کبھی کبھی سیتو کی بیوی اس کے پتوں سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے۔ کیونکہ
 اس میں پچھلے اسی برسوں کے سارے آنسو اور ساری اسنگیں اور ساری فحش اشتہائیں
 جذب ہیں۔ آنسو پونچھ کر سیتو کی بیوی پھر اسی ہمت سے کام کرنے لگتی ہے۔ جیسے کچھ ہوا ہی
 نہیں۔ نہیں گولی نہیں چلی۔ کوئی جیل نہیں گیا۔ بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چل رہی ہے۔

مے لو باتوں باتوں میں وزیر اعظم صاحب کی گاڑی ٹکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری
 میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی۔ وزیر اعظم صاحب درشن دینے کے لئے گاڑی
 سے ٹکل کے ٹھوڑی دیر کے لئے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے اور شاید ہوا میں جھولتی ہوئی ان
 چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہاکشتری کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔ یہ
 چھ ساڑھیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں۔ ایسی معمولی معمولی عورتیں
 جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنے ہیں جہاں ایک کونے میں چوٹھا سلگتا
 ہے۔ ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے۔ اوپری طاقت میں شیشہ ہے۔ لنگھی ہے
 سینہ در کی ڈبیا ہے۔ کھاٹ پر پنخاچہ سو رہا ہے۔ الگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ
 ان چھوٹے چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کو بنانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں
 جنہیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے بچوں کی مائیں ہیں۔
 ہمارے بھولے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں۔ ہماری
 پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیر اعظم صاحب! یہ ہوا میں

جموئی ہوئی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں۔ تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا ملک۔ کوئی بڑا عہدہ۔ کوئی بڑی موٹر گاڑی پر سٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پراپرٹی، یہ ایسی کسی چیز کی طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں۔ دیکھئے یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنے بچپن کا کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے، جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی میٹھی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے جس کے گیت مرچکے ہیں اور جس کے پاس اپنے بچوں کے لئے اسکول کی فیس نہیں ہے۔ یہ لڑیا ہے جس کا خاوند بیکار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطا ہے جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دہن کی ساڑھی ہے جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمتی ہے۔ یہ بدھی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو ہندو کی گولی کو ہل کے پھالے میں تبدیل کر دینا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کہیں اسٹے اور گندم کے خوشے بن کر لہرانے لگے.....

لیکن وزیراعظم صاحب کی گاڑی نہیں کی اور وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے اور تقریر کرتے کرتے چو پائی پر چلے گئے۔ اس کے میں آپ کہتا ہوں کہ اگر بھی آپ کی گاڑی اسی گڈے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھئے جو ہاتھ کی پل کے بائیں طرف لٹکتی ہیں اور پھر آپ ان ہاتھ کی پل کی ساڑھیوں کو دیکھئے جنہیں دھوپ نے اس پل کے دائیں طرف سوکھنے کے لئے لٹکا رکھا ہے اور جو ان گھروس آئی ہیں جہاں اپنی اپنی چنیوں والے کارخانوں کا مالک اپنی اپنی تنخواہیں پلنے والے رہتے ہیں آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف ضرور دیکھئے اور پھر اپنے آپ کو چمکے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں دیکھئے میں سے اشتراکی بننے کے لئے نہیں کہہ رہا ہوں میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں۔ میں صرف یہ جانتا چاہتا ہوں کہ آپ ہاتھ کی پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف ؟

کنہیا کال کیوں

شن شن شان

ملک شن شن شان (جسے کئی لوگ شن شن شان بھی کہتے ہیں) کو آزاد ہوئے اب
 لگ بھگ بارہ سال ہو چکے تھے۔ لیکن اس بارہ برس کے عرصے میں اس کے سوا کہ ملا آزاد
 ہو گیا تھا اور کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ زمین پہلے کی نسبت سخت تر تھی اور آسمان دور تر۔ یہ درست
 ہے کہ جب ملک آزاد ہوا تھا تو شن شن شانی جھنڈے لہرائے گئے تھے۔ شن شن شانی
 ترانے گائے گئے تھے۔ لیکن وہ تو اب ماضی بید کی بات تھی۔ ملک کا جو حال اس وقت تھا
 اس کے پیش نظر بہت کم صحیح عقل انسان یہ کہہ سکتے تھے کہ وہ واقعی آزاد ہیں۔ البتہ عوام
 جنھیں ہر صدی اور ہر ملک میں جُل دیا گیا ہے۔ لیڈروں کے بار بار یقین دلانے پر یہ
 ماننے کے لئے تیار ہو گئے تھے کہ انھوں نے غلامی کا جو اتار پھینکا ہے۔ ان میں سے بھی
 بعضوں کا ایمان کبھی کبھی متزلزل ہو جاتا تھا۔ اس وقت وہ کسی مقامی رہنما کی کوٹھی
 پر جلتے اور اس سے کہتے۔ "حضور ہمیں بتائیے، کیا ہم واقعی آزاد ہیں؟ کیا واقعی۔۔۔
 ہمیں یقین دلا دیجئے۔ ایک بار پھر یقین دلا دیجئے جیوند!"

اس پر وہ گہرا کر ان کی طرف دیکھتا اور ایک ساعت کے لئے نگاہیں نیچی کر لیتا

اس کی نگاہ اپنے کخواب کے چنے پر پڑتی۔ پھر وہ نگاہ اٹھا کر کمرے میں پڑے ہوئے قیمتی سامان کا جائزہ لیتا اس کی آنکھ میں ایک چمک لہرانے لگتی۔ "ہاں ہاں ہم آزاد ہیں، بالکل آزاد یقین کیجئے، مجھ پر یقین کیجئے۔" کیا یہ کافی ثبوت نہیں کہ ہم یہاں اکٹھے بیٹھے ہیں۔ آپ سب میرے پاس بیٹھے ہیں۔ اور، اور میں آپ کا خادم ہوں؟ وہ عوام کے پچھٹے ہوئے کپڑوں سے نظر چرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہتا۔ "یقین جانو؟ ملک کے آزاد ہونے کے بعد ملک میں ایک زبردست طوفان آیا تھا جس کی تمام ذمہ داری عوام نے قومی بازیگروں سے اور قومی بازیگروں نے عوام سے منسوب کی تھی۔ لیکن سو خراہ ذکر نے اعلان کر دیا تھا کہ ایک معمولی حادثے کو زبردست طوفان کا نام دینا مبالغہ آمیزی کی انتہا ہے۔

شن شن شان کے آزاد ہونے کے بعد رہنماؤں کی سب سے بڑی "ابجاد" ایک تکیہ کلام تھا۔ جسے وہ ہر موقع پر استعمال کر کے اپنا ٹھویا ہوا وقار دوبارہ حاصل کر لیتے تھے۔ وہ تکیہ کلام تھا: "الہم دین کا چراغ"۔ یہ تکیہ کلام واقعی بڑے کام کی چیز تھا کیونکہ شکل لمحوں میں ہمیشہ اڑے اُتاتا تھا۔

عوام پکارتے: "حضور ہیں، روٹی نہیں ملتی" تو جواب ملتا: "کیا ہمارے پاس الہم دین کا چراغ ہے کہ ہم آپ کو چشم زدن میں روٹی مہیا کر دیں؟"

"حضور! کپڑا نہیں ملتا"

الہم دین کا چراغ کیجئے۔ ہمارے پاس الہم دین کا چراغ نہیں کہ راتوں رات کپڑا تیار کرنے کا کارخانہ لگا دیں؟

"جناب نمک نہیں ملتا"

”نک کے بغیر گزارہ کیجئے۔ آؤ ہمارے پاس الہدین کا چراغ تو نہیں کہ جو آپ کو...“

جب تک ملک آزاد ہوا تھا اور باب حکومت نے کام کرنے کا ایک نہایت سہل طریقہ نکالا تھا۔ یعنی عوام کو کھلی اجازت دیدی تھی کہ اپنی ہر شکایت مقامی افسروں کے گوش گزار کریں وہ اس شکایت کو غور سے سنیں گے اور اپنی رپورٹ اعلیٰ افسروں کے پاس بھیج دیں گے جو اس رپورٹ کو نہایت غور سے پڑھیں گے۔ اور اس پر اپنے دستخط کر کے جناب وزیر اعظم کی خدمت میں ارسال کریں گے۔ وزیر اعظم صاحب فائل کا بغور مطالعہ کرینگے اور بغور مطالعہ کرتے رہیں گے اور پھر کسی فرصت کے لمحے میں اس کام سے متعلق ایک کمیٹی مقرر کریں گے اور ممبران کمیٹی کو یہ حق عطا فرمائیں گے کہ وہ عوام کی شکایات پر غور کریں اور غور کرتے رہیں۔ چاہے اس وقت تک غور کرتے رہیں جس وقت تک کہ وہ شکایات خود بخود رفع ہو جائیں۔ ایک دفعہ ایک شہر میں لوگوں کو پانی کی کمی محسوس ہوئی اور پیاس کی شدت سے بے حال ہونے لگے۔ حکومت نے ایک پانی کمیٹی مقرر کی جو چھ مہینے کی مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ پانی تو بے حد عام چیز ہے اور قدرت کی ان نعمتوں میں سے ہے جو مفت ہر خاص و عام کے حصے میں آتی ہیں۔ جسے قدرت نے بہم پہنچانے کے وسیع انتظامات کر رکھے ہیں۔ پانی کی کمیابی کی شکایت کا تعلق قدرت سے ہے۔ حکومت سے نہیں بلکہ ایسی شکایت حقیقتاً قاذو مطلق کی توہین کے مترادف ہے۔ ویسے تو حکومت پانی کا انتظام فی الفور کر سکتی ہے کیونکہ چشمہ ویری ناگ سے پانی لانے کا انتظام ہو سکتا ہے۔ مگر ایسا انتظام کرنا بے کار ہے۔ چونکہ وہ تمام لوگ جو پانی پانی پکارتے تھے اب اس دنیائے آب و گل میں نہیں رہے۔ اس لئے کاغذات فائل کر دیئے جائیں۔

ملک کے آزاد ہوتے ہی قومی رہنماؤں نے رفاہ خلائق کے لئے بڑے بڑے
 پروجیکٹ تیار کر لئے تھے۔ یہ پروجیکٹ دودھ اور شہد کی لہریں چلانا، ہر محردے کے لئے
 بیوی مہیا کرنا، غریبوں کے لئے شیش محل بنانا اور اس قسم کی دیگر تجاویز پیش کرتے
 لیکن اتنی جلدی یہ پروجیکٹ کیسے سرمنڈہ تکمیل ہو سکتے تھے۔ از باب بست و کشاد
 کے ہاتھ میں الہہ دین کا چراغ تو نہ تھا۔

لیکن ٹھہریے اس سے کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ چراغ وہی چراغ ہے جو کہ
 پردہ سمیں پر دکھایا جاتا ہے۔ اور جس کے رگڑنے سے وہ حسد سے جلی بھی حسینہ آمو جو
 ہوتی ہے۔ ایسے چراغ تو شاید ہوں۔ الہہ دین کا جن والا چراغ تو نہیں تھا۔
 الہہ دین کا چراغ نہ ہونے کی وجہ سے عوام مایوس ہونے لگے۔ لیکن رہنماؤں
 کو اپنی صلاحیتوں پر پورا اعتماد تھا۔ انہیں یقین تھا کہ چند دن کے اندر اندر ہی وہ
 ملک کی کیا پلٹے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

رفتہ رفتہ ملک ہر وہ چیز غائب ہونے لگی جس کے بغیر زندگی ناممکن ہے، چال
 کھانڈ، سگریٹ، نمک عوام نے مقامی افسروں سے شرکایت کی کہ کوئی چیز کسی قیمت
 پر دستیاب نہیں ہو سکتی۔ انہوں نے حسب معمول اس حادثہ کی اطلاع حکام بالا کو
 پہنچا دی۔ حکام بالانے وزیراعظم کو مطلع کیا اور وزیراعظم نے ایک مختصر تاریخ میں عوام
 کو تلقین کی کہ ”اگر کھانے کو کچھ نہیں ملتا تو عوام کو غم ملت کھانا چاہیے۔“
 چند سال عوام غم ملت کھاتے رہے۔ لیکن جب اس سے شکم بڑی نہ ہوئی۔ تو
 انہوں نے پرائم منسٹر کو لکھ بھیجا۔ ”حضور ہم غم ملت کھا کھا کر تنگ آ گئے ہیں کوئی دوسری

چیز بھیجے۔“

پرائم منسٹر نے جواب لکھا۔ ”خاکسار اس معاملہ میں مجبور ہے آپ شہنشاہِ شن شن سے براہِ راست خط و کتابت کیجئے۔“

چنانچہ عوام نے شہنشاہِ شن شن کی خدمت میں ایک درخواستِ خون کے آئسوؤں سے لکھ کر گزاری۔ شہنشاہِ شن شن نے اس درخواست کو پڑھنے کے بعد حکم صادر کیا کہ نفسِ نفیس آزادی کی بارہویں سالگرہ پر عوام سے خطاب کریں گے بارے آزادی کی بارہویں سالگرہ آئی اور شن شن شان کے دارالخلافہ میں حضورِ شہنشاہ نے بیس لاکھ کے مجمع میں جو ملک کی آبادی کا نوے فی صد حصہ تھا، ایک نہایت مدلل تقریر کی۔ ”حضرات! آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ بھوکوں مر رہے ہیں، لیکن میرا خیال ہے کہ یہ آپ کا وہم ہے آپ کو ضرور کسی شخص نے بہکا یا ہے ورنہ آپ کو یہ وہم لاحق نہ ہوتا۔ آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میں نے بارہ سال کے عرصے میں آپ کے لئے کیا کیا۔ آپ سخت ناشکرے ہیں کیا آپ کو معلوم نہیں کہ اس مختصر وقت میں میں نے آپ کی بہبودی کے لئے کم از کم بارہ ہزار اسکیمیں تیار کی ہیں جن میں سے چند پر مستقبلِ قریب میں عمل بھی کیا جائے گا۔“

میری طرف دیکھئے! کیا میں نے صرف آپ کی خدمت کے لئے اس عہدے کی مصیبت اپنے سر نہیں لی۔ مجھے چھوڑیئے میں نے اپنے پانچ درجن عزیزوں پر صرف اس لئے بڑے بڑے عہدوں کی مصیبت ڈال رکھی ہے کہ وہ صبحِ شام آپ کی بہتری کے لئے پراجیکٹ تیار کرتے رہیں، کیا ہم آپ کے سفاد کے لئے قربانی کے کرے نہیں بنے؟ بولو!

شاید یہ سمجھتے ہیں کہ مجھے حکومت کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا یہ الزام بھی بہت حد تک درست ہے۔ حضرات! میں نے ساری عمر جیل خانے یا قوم کے لئے جوشیلے لغزے ایجاد کرنے میں گزاری۔ ان حالات میں آپ مجھ سے اور کیا توقع کر سکتے ہیں۔ آخر میرے پاس الہ دین کا چراغ تو ہے نہیں کہ راتوں رات ایک قابل رشک عکرم ان بن جاؤں آپ مجھ پر اعتماد رکھیے انشاء اللہ آئندہ پانچ برس میں آپ کو ایک لائق قدر شہنشاہ بن کر دکھاؤں گا۔ بشرطیکہ اس عرصے میں آپ کسی کے ہر کانٹے پر چھو کوں نہ مر گئے۔ حضرات، بارہ سال کا عرصہ قوموں کی زندگی میں ایک لمحے سے بھی کم وقت رکھتا ہے آپ کو اتنی جلدی مایوس نہیں ہو جانا چاہیے تھا۔ آپ کہتے ہیں آپ کو گہوں نہیں ملتا۔ گہوں نہیں ملتا تو کھائے جو نہیں ملتے؟ باجرہ کھائیے۔ باجرہ نہیں ملتا۔ فاقہ کیجئے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ زیادہ سے زیادہ آپ مسلسل فاقوں کی وجہ سے مرجائیں گے لیکن حضرات میری دانست میں قوم کے لئے جینے سے قوم کے لئے مرجانا کہیں افضل ہے۔ آپ اپنی دو گردنوں کے تانے پر منظر دوڑائیے۔ اپنے اسلاف کے کارناموں کا جائزہ لیجئے۔ اپنی روایات کا مطالعہ کیجئے۔ آپ محسوس کریں گے کہ فاقہ مستی ہمارا مہکتا بڑا اور سب سے قیمتی ورثہ ہے (تالیاں)

مجھے افسوس ہے کہ مجھے خود بہترین سامان اکل و شرب میسر ہیں۔ اس لئے میں اس سعادت سے محروم ہوں کہ جو ہمارا قومی سرمایہ ہے۔ لیکن حضرات! آپ کتنے خوش نصیب ہیں کہ آپ قوم کے لئے فاقہ کشی کر رہے ہیں۔ آنے والی نسلیں بشرطیکہ وہ زندہ رہیں آپ پر رشک کریں گی اور مستقبل کا مورخ اگر واقعی کوئی مستقبل کا مورخ ہوا، آپ کی قربانیوں کا ذکر سنہرے الفاظ میں لکھے گا۔ آپ فاقہ کشی کا نیا معیار قائم کر رہے ہیں۔ کیونکہ

ہزاروں نہیں لاکھوں کی تعداد میں بھوکے مر رہے ہیں۔ لیکن یاد رکھیے آپ کی فاقہ مستی ایک دن ضرور رنگ لاکر رہے گی۔ اس بات کا مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا اس امر کا کہ مجھ سے بہتر آپ کو کوئی دوسرا شہنشاہ نہیں مل سکتا۔ حضرات! آپ کو اپنے فرائض پہچاننے چاہئیں۔ مدت ہوئی میں نے اپنی ایک تقریر میں آپ کے فرائض ان الفاظ میں متعین کئے تھے کہ آپ کو ہر حالت میں قوم و ملک کی خاطر مرنا ہے۔ تاکہ آپ کے عزیز وطن شن شن شان اور آپ کے عزیز تر شہنشاہ زندہ رہ سکے۔ میں اس لئے اور زیادہ نہیں کہوں گا کیونکہ اس وقت مجھے سخت بھوک لگ رہی ہے۔ اور میرا فاسا ماں میرا انتظار کر رہا ہے۔

خیر! میں وہ بات تو ہرگز نہیں کروں گا کہ آپ روٹی مانگنے آئیں اور میں آپ کو کھانے کے لئے پتھر پیش کروں۔ میں سخت شرمندہ ہوں کہ مجھے فی الحال الہ دین کا چراغ دستیاب نہیں ہوا جس کی مدد سے میں بیس لاکھ بھوکے انسانوں کے لئے پتھر کی مطلوبہ مقدار کا انتظام کر سکوں۔ لیکن میں نے آپ کو پتھر سے بہتر چیز دی ہے۔ میرا مطلب ہے یہ تقریر آپ اب بڑی خوشی سے اپنے گھروں کو واپس جاسکتے ہیں۔ ہاں اگر غیر مناسب سمجھیں تو ایک نعرہ شن شن شان زندہ باد لگاتے جائیے۔ اور خدا سے دعا کیجئے کہ وہ آپ کے شہنشاہ کی عمر دراز کرے اور اسے جلد از جلد الہ دین کا چراغ بہم پہنچائے۔ شب بخیر!

شن شن شان (جسے کئی لوگ شن شن شان بھی کہتے ہیں) اس کے عوام خوشی خوشی گھروں کو لوٹے اور اس رات ہر مندر و مسجد میں دعائیں مانگی گئیں۔ خداوند کریم یعنی الشوریہ مآتما شہنشاہ شن شن شان کو اپنی پہلی فرصت میں الہ دین کا چراغ بہم پہنچائے۔

مہمند زمانہ

صبح، دوپہر، شام

یہ عجیب اتفاق کی بات ہے کہ جب کبھی میں اس بازار سے گذرتا ہوں وہ عورت مجھے اس بازار میں چکر کاٹتے ہوئے ضرور ملتی ہے۔ یوں عورتیں دیکھنا کوئی گناہ نہیں مگر کر خالص عورت عورتیں۔ بھلا عورتیں ہی کیوں۔ مرد بھی خوبصورت ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر جی خوش ہوتا ہے اور ذہن میں اچھی اچھی چیزیں ابھرتی ہیں۔ حسین عورتوں کو دیکھ کر خوبصورت چیزوں کا خیال آتا ہے۔ مثلاً ریشمی کپڑے، سنہری بال، دھان کے کھیت، ناریل کے درخت کے نیچے ابھرتا ہوا چاند، دلا دیز مسکراہٹ۔ گگاتا ہوا آبشار، شرمائی ہوئی آنکھیں نیلا آکاش، پھیلی ہوئی شفق، شانوں پر بکھرے ہوئے بال، ہنستا ہوا چہرہ، مصحف نگاہیں چوڑا چکلا سینہ، عشق اور ہجر وصال کی باتیں، اور اسی طرح مختلف اقسام کی رنگا رنگ تصویریں ذہن کے پردے پر ابھرتی ہیں، اور پل بھر کے لئے ذہن کے تاریک گوشوں کی سنور کو جاتی ہے۔ لیکن اس عورت کو دیکھ کر مجھے عجیب قسم کا احساس ہوتا ہے۔ دراصل جب میں اسے اس حالت میں دیکھتا ہوں تو مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ یہ عورت نہیں ہو بلکہ کچھ اور شے ہے عجیب حسرتناک چہرہ لئے ہوئے ادھر ادھر گھومتی رہتی ہے۔

ایک دن دوپہر کے وقت مجھے ٹرام کے اڈے پر دکھائی دی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ آپ بھی اس بازار میں سے کسی بار گزرے ہوں گے۔ اور شاید آپ کی نگاہ اس عورت پر پڑی ہو۔ کچھ کہہ نہیں سکتا۔ یہ نگاہ نگاہ کی بات ہے۔ ہو سکتا ہے نہ پڑی ہو، بہر حال یہ بازار اس شہر کا سب سے بارونی اور مشہور بازار ہے۔ یہاں بڑی بڑی دوکانیں ہیں۔ فلک بوس عمارتیں ہیں۔ اور بڑے بڑے یو پارکوں کی نفیس اور آراستہ دوکانیں یہاں دوکاندار اپنی چیزوں کو نمائشی کمبوں میں سجا کر رکھتے ہیں تاکہ گاہک کی نظر ان چیزوں پر پڑے اور وہ خریدنے پر مجبور ہو جائے۔ میں اس بازار میں صرف اس لئے آتا ہوں کہ ان خوبصورت چیزوں کو دیکھ سکوں۔ میری جیب میں اتنے روپے نہیں ہوتے کہ ان چیزوں کو خرید کر پہن سکوں یا ان چیزوں کو خرید کر گھر کو سجا سکوں۔ صرف دل بہلانے کے لئے ادھر آجاتا ہوں۔ پل بھر کے لئے ٹھہرتا ہوں چھپتی ہوئی نگاہ ڈال کر آگے بڑھ جاتا ہوں زندگی میں بہت سی تمنائیں، خواہشیں اور آرزوئیں اسی طرح سینے میں دفن ہو جاتی ہیں۔ اور گھٹ کر مر جاتی ہیں۔ پھر بھی دل بہلانے میں کیا ہرج ہے۔ اگر آپ ادھر سے آئیں تو دائیں ہاتھ کی جانب، ایک عالیشان عمارت آپ کی توجہ اپنی طرف کھینچ لے گی۔ اس دوکان کے باہر کے حصے میں بڑے بڑے نمائشی کسے لگائے گئے ہیں اور مختلف چیزوں کی بڑی سیلے سے نمائش کی گئی ہے۔ ایک طرف عورتوں کے پہننے کی چیزیں ہیں۔ اور دوسری طرف مردوں کے۔ میں دونوں کو دیکھ لیتا ہوں۔ ان چیزوں کی قیمتیں بہت زیادہ ہیں۔ کم از کم میں تو خریدنے سے رہا۔ باقی رہا آپ کا معاملہ آپ اس دوکان پر جا کر ان چیزوں کی قیمتیں پڑھ سکتے ہیں۔ اور اگر بلیک مارکیٹ سے آپ اپنے روپے کسائے ہیں تو یقیناً آپ ان چیزوں کو خرید بھی سکتے ہیں۔

تو اس روز دھوپ بہت تیز تھی۔ دوپہر کا وقت تھا۔ اور میں بازار میں پیدل جا رہا تھا۔ یوں تو اس بازار میں ٹراموں اور بسوں اور کاروں کی گھاگھی رستی ہے امیر آدمی کاروں میں سیر کرتے ہیں۔ اور غریب ٹراموں اور بسوں میں۔ اور مجھ ایسے لوگ صرف پیدل چلتے ہیں۔ اس دن مجھے ضروری کام تھا اس لئے تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا۔ جلدی جلدی ان لال پیلے کپڑوں پر نظر پھینکتا ہوا آگے جا رہا تھا کہ میں ٹرام کے اڈے پر پہنچ گیا۔ یہاں ٹرامیں اُگڑ رہی ہیں اور آرام کرتی ہیں۔ مسافر اترتے اور چڑھتے ہیں۔ میں پیدل چلتے چلتے تھک گیا تھا۔ خیال آیا کہ ٹرام میں بیٹھ جاؤں۔ ٹرام میں بیٹھنے لگا تھا کہ میری نگاہ اس عورت پر پڑی۔ میں نے اس عورت کو دیکھا۔ اور عورت نے میری طرف دیکھا اسے دیکھ کر مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میں اس عورت کو کئی بار دیکھ چکا ہوں۔ اس عورت کو دیکھ کر میرے ذہن میں عجیب قسم کے خیالات آئے۔ وہ دیر تک ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ مسافر اترتے رہے جاتے رہے۔ کوئی ٹرام میں بیٹھتا اور کوئی اترتا۔ لیکن عورت ادھر ادھر ٹھہرتی رہی۔ اور پھر ہجوم میں غائب ہو گئی۔ اس عورت کی تصویر اگر میں کھینچ دوں تو شاید آپ کے ذہن میں خدو خال اُبھر آئیں۔ اگر عورت خوبصورت ہوتی تو میں اسے قوسِ قزح سے تشبیہ دیتا۔ اس کی آنکھوں کو کنوؤں کے پھولوں کی طرح بتاتا۔ اس کے رخساروں کو پھول کی پتیوں کی طرح سُرخ کر دیتا۔ اس کی نگاہوں میں بجلی کی تابناکی بھردیتا۔ اس کے سینے میں سمندر کا سا راتہ و جزر بھر دیتا۔ اور اس کے گونے گونے ڈور تھی لیما سے زیادہ خوبصورت دکھاتا۔ اور اس کے جسم کی رنگت برف کی طرح سفید پیتا۔ لیکن میرے سامنے ایک دہلی تیلی سی عورت گھڑی تھی جس نے ایک پھولوں والی دھوتی پہن رکھی تھی چہرے کی رنگت غالباً گندمی ہونی چاہیے۔ لیکن جوں جوں اس

عورت کی عمر بڑھتی گئی تو اس کی زنگت سیاہ ہوتی گئی۔ گال چمک گئے تھے اور ان پر سیاہ جھائیاں ابھرتی تھیں۔ بالوں میں چمک کے بجائے ردکھاپن تھا اور آنکھوں سے حزن و ملال کی جھلک نمایاں تھی اور چال میں نقاہت اور کمزوری آچکی تھی۔ اگر اس عورت کا سر سے لیکر پاؤں تک جائزہ لیا جائے تو اس سے صاف ظاہر ہوگا کہ کافی عرصے سے اس عورت نے اچھی غذا نہ کھائی ہوگی۔ غذا کی کمی کی وجہ سے جسمانی دل کشی غائب ہو چکی تھی۔ ایک بات جو قابلِ غور تھی وہ تھی اس کے ہونٹوں کی لپسٹک جو بے حد سرخ تھی۔ سائے جسم میں صرف یہی جگہ تھی جہاں خون کا گمان ہو سکتا تھا۔ رخساروں پر اگر انہیں رخسار دکھا جائے، پوڈر چھڑکا ہوا تھا اور ہلکی سی سرخی بھی ملی ہوئی تھی۔ لیکن دھوپ میں چلنے پھرنے کی وجہ سے پوڈر اور سرخی اس طرح گڈمڈ ہو گئے تھے کہ چہرے پر عجیب قسم کی اشکال نمودار ہو رہی تھیں۔ وہ اس وقت بالکل ایک پرانی کار کی طرح دکھائی دیتی تھی۔ جو ستو آرا استعمال سے اپنا رنگ روپ کھو بیٹھی ہے۔ میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ ٹام مسافروں سے کچھا کچھ بھر گئی۔ اور چل پڑی۔

کئی دن گزر گئے میں اس طرف نہ گیا۔ عورت کی یاد میرے دل سے اتر چکی تھی۔ اس کے نقشِ آہستہ آہستہ میرے ذہن کی چادر پر مدھم پڑنے جا رہے تھے آخر میرا اور اس کا کیا رشتہ تھا میں کیوں اس عورت کے متعلق سوچتا اگر وہ کمزور ہے، بد صورت ہے، اسے روٹی نہیں ملتی تو میں کیا کروں۔ اگر وہ غریب ہے تو میں اسے امیر کس طرح بنا سکتا ہوں۔ میں خود بھی غریب ہوں میں ہی نہیں اس دنیا میں لاکھوں

مردوں آدمی غریب ہیں۔ ناتواں ہیں، بد صورت ہیں۔ بھوکے رہتے ہیں، ننگے ہتے ہیں۔ بھلا میں ان کی بھوک اور ناداری کس طرح دد کر سکتا ہوں۔ اس دنیا میں کچھ اور لوگ بھی ہیں جو امیر ہیں، جو اچھا کھانا کھاتے ہیں اور نفیس کپڑے پہنتے ہیں۔ عالیشان گھٹیوں میں رہتے ہیں۔ اور ریس کھیلتے ہیں۔ بھلا ان باتوں کا میرے پاس کیا علاج ہے؟

اس دن جب میں گھر سے نکلا تو آسمان نیلا اور شفاف تھا اور ہلکی ہلکی سی دھوپ تھی۔ اور دسبر کا مہینہ۔ یہی جی میں آئی کہ گھر سے نکل۔ ٹہلتا ٹہلتا تو بازار چل۔ آج بازار میں کافی رونق تھی۔ ضرورت سے زیادہ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ آج کرسمس ہے جسبھی لوگ خوبصورت کپڑے پہنے ہوئے ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ لوگوں کے ساتھ ان کی بیویاں تھیں۔ جو بن ٹھن کر نکلی تھیں۔ اور اپنے بچوں کو بھی ساتھ لائی تھیں۔ لال پیلے غبارے کپڑے پہنتے کھیلتے ہوئے یہ لوگ دکانوں سے نکلے تھے اور چیزیں خرید رہے تھے۔ اور اپنی اپنی سوٹروں میں بیٹھ کر اپنے اپنے گھر دلگے جا رہے تھے۔ میں نے اپنے کپڑوں پر نگاہ ڈالی، قمیص کافی گندی اور سیلی تھی۔ کالر بھٹ چکا تھا۔ اور بوٹوں پر کئی ہفتوں کی گرد جی ہوئی تھی۔ اس دن مجھے اپنے گندے اور سیلے کپڑوں پر سخت غصہ آیا۔ میرے قدم یکایک اس عالیشان دکان کی طرف اٹھ گئے۔ (نمائشی کبس) میں کپڑے بڑی شان سے سجائے گئے تھے۔ ادھر ادھر عورتوں کے کپڑے تھے۔ خوبصورت محبتوں کو رنگ برنگ ساڑھیاں پہنائی گئی تھیں۔ ایک دھمبوں کو فراک اور بلاؤز پہنائے گئے تھے۔ اور دھمبوں میں ان تمام نقوش کو واضح کیا گیا تھا جس سے عورت کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہاتھ

کی انگلیاں محرطی اور ناخنوں پر ہلاکی سُرخی سپید رنگت پر سیاہ بلا وز آویزاں تھا۔ ان میں سے بازو سیب کی شاخوں کی طرح جھانک رہے تھے۔ آنکھوں میں بجلی تھی۔ برف تھی، اور بھنویں کسان کی طرح تنی ہوئی تھیں۔ ساتھ ہی ہار سنگھار کا سا زہر سامان دکھا ہوا تھا۔ یہ سبز سبز منگوں کی مالا تھی جو کسی حسین عورت کی گردن میں جھانک ہو کر ایک عجیب اثر پیدا کر سکتی ہے۔ میں زیادہ عرصہ ادھرن ٹھیر سکا اور مردوں کی طرف چلا گیا۔ سامنے ایک سفید قمیص نظر آئی اور میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگی قبت ۲۵ روپے۔ اور مجھے جھٹکا لگا۔ اور میری نگاہ منظر پر جمی ہلکا آسمانی رنگ تھا۔ اس منظر کا میری گردن کے گرد ایک جھرجھری سی آگئی۔ اور گردن کے ارد گرد ایک ظلم سی حرارت محسوس ہوئی۔ قیمت ۳۵ روپے جو وہ آنے۔ قیمت پڑھتے ہی گردن اکڑ گئی۔ میں فوراً آگے بڑھا۔ قریب ہی ایک جوتاب میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اور پھر اس نے شرم سے گردن جھکالی۔ قیمت صرف ۸ روپے ۵۰ آنے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے پاؤں میں ایک کانٹا چبھ گیا ہو۔ ساتھ ہی فلیٹ ہیٹ نے چھینک ماری اور کہنے لگی۔ کیا مجھے نہ خریدو گے؟ اور میرا ہاتھ یکا یک اپنے بالوں پر جبار لگا۔ بال سخت اور کھردرے تھے۔ ہاتھ اپنی جگہ پر آگیا۔ اور ماتھے پر ہلکا سا پسینہ آگیا۔ اتنے میں ایک آدمی نے آکر کہا۔ "Please to this side" اور میں بالکل ایک طرف ہو گیا۔ اور دوکان کو چھوڑ کر آگے چل دیا۔ لوگ جوق در جوق آتے تھے۔ چیزیں خرید رہے تھے اور کارڈوں میں بیٹھ کر جارہے تھے۔ اور میں پیدل چلتا ہوا ٹرام کے اڈے پر آگیا۔ اور جونہی ٹرام پر چڑھنے لگا — وہ عودت نظر آئی۔ وہی پھولوں والی دھوٹی، چلتے پھرنے کا وہی انداز، نگاہوں میں

ناامیدی۔ اور چال میں نقاہت اور کمزوری۔ آنکھیں پٹی پٹی کسی کی متلاشی۔ لوگوں کو دیکھتی ہوئی۔ پن بھر کے لئے جائزہ لیتی ہوئی۔ کبھی کبھی اسید سے وابستہ ہو کر۔ اور آخر کار ناامیدی کے گڑھے میں گر کر نیچے جھک جاتیں۔ لوگ ٹراسوں پر چڑھ رہے تھے اتر رہے تھے اور اس کی نگاہیں مسافروں کو ٹوٹتی ہوئی آگے بڑھ رہی تھیں۔ پیچھے ہٹ رہی تھیں۔ اس وقت میرے دل میں یہ آیا کہ آگے بڑھ کہ اس عورت سے بات کروں۔ پوچھوں کہ وہ یہاں کیوں آتی ہے۔ اسے یہاں کیا کام ہے۔ اس کا رنگ کیوں پیلا ہے۔ اس کی آنکھیں اندر کیوں دھنسی ہوئی ہیں۔ اور وہ کیوں بار بار مسافروں کی طرف دیکھتی ہے۔ یہ سوچ کر میں آگے بڑھا لیکن عورت میری نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔ اسے نہ پا کر میرے دل میں یاس اور غم کے بادل اُٹ اُٹے اور زندگی کے بے بسی اور بے بسی پر سخت غصہ آیا۔

وہ صبح بہت ہی خوبصورت تھی۔ دلکش تھی، آسمان نیلا اور شفاف تھا۔ اور لوگ جوق در جوق ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ اس وقت صرف میں اداس تھا اور وہ عورت اداس تھی۔ دن بھر اس عورت کی تصویر میری نگاہوں میں گھومتی رہی۔ اور اس دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ اگر دوبارہ یہ عورت مجھے ملی تو میں ضرور اس سے باتیں کروں گا۔ اس کی مدد کروں گا۔ اس سے پوچھوں گا کہ وہ کیا کرتی ہے اس کے کتنے بچے ہیں۔ اس کا گھر کہاں ہے ؟

اسی سوچ بچار میں کئی دن گزر گئے۔ اور میں اس طرف نہ جاسکا۔ اس عورت کی یاد دل سے نکل چکی تھی۔ جیسا ایسی تصویریں کب تک ذہن میں رہتی ہیں۔

یہ تصویریں سمندر کی لہروں کی طرح ہوتی ہیں۔ جو آنِ واحد میں ذہن کے سامنے آتی ہیں اور ذہن کے پردے سے ٹکر کر پیچھے ہٹ جاتی ہیں۔ اور ذہن پر ایک خفیف جھٹکا چھوڑ جاتی ہیں۔ لیکن یہ جھٹکے اتنے خفیف ہوتے ہیں۔ اتنے ہلکے پھلکے ہوتے ہیں کہ کوئی داغ نہیں چھوڑتے۔ صرف ہلکی ہلکی ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ جو لمحہ بھر کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی ہیں۔ اور پھر انسان کا ذہن وہ سری طرف منعطف ہو جاتا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے بتایا کئی دن گذر گئے، راتیں گذر گئیں۔ خوابناک راتیں اور کئی حسین دن آئے اور چلے گئے۔ اندھیری راتیں آئیں اور دلوں میں پرانی یادوں کو اجاگر کر گئیں۔ اور پھر ایک شام میں اسی طرف سے گذرا۔ اس دن میری جیب میں کچھ روپے تھے۔ اسی لئے میری چال میں خود اعتمادی کی جھلک تھی۔ شام کے وقت اس بازار میں گم بھیڑ ہوتی ہے۔ یہاں کے دوکاندار لاکھوں روپے کے مالک ہوتے ہیں۔ اس لئے شام ہوتے ہی وہ دوکانیں بند کر لیتے ہیں اور اپنی اپنی عشرت گاہوں کی طرف رخ کرتے ہیں۔ وہاں شراب ہوتی ہے مرغن کھانا ہوتا ہے۔ اور ان کی گوری گوری خوبہر و محبوبائیں ہوتی ہیں۔ یہ لوگ ان سے بہتے ہیں کھلتے ہیں۔ ناچتے ہیں پھر عہد و پیمان ہوتے ہیں۔ وفا اور بے وفائی کے چرچے ہوتے ہیں۔ اپنی اپنی بیویوں کے کرحت سلوک کا رونا روتے ہیں۔ اور اپنی محبوباؤں کے کندھوں پر سر رکھ کر اپنے زائد سرمائے کا چرچا کرتے ہیں۔

آج جب میں اس عالی شان دوکان کی طرف نکلتا تو ان شیشوں کی الماریوں میں سے چند آدمی کپڑے نکال رہے تھے۔ میرے سامنے سب شیشے کی الماریاں خالی ہوئیں صرف Hangers باقی رہ گئے تھے۔ کئی بار میرے دل میں آیا۔ کہ کسی رات

ادھر آؤں گا۔ اور ان شیشے کی الماریوں کو توڑ کر اپنے لئے کپڑے لے جاؤں گا لیکن آج معلوم ہوا کہ رات کے وقت یہ کپڑے ان نمائشی کمبوس میں نہیں رکھے جاتے۔ اس خیال کے ذہن میں آتے ہی میں کچھ اُداس سا ہو گیا۔ اور آگے بڑھا۔ تاریکی کافی بڑھ چکی تھی۔ اور راستہ آوارہ اور اکیلا دکھائی دیتا تھا۔ ٹرام میں مسافر کم تھے۔ دکانوں کے قریب سلع چوکیدار نظر آ رہے تھے۔ یہ چوکیدار سیری طرف گھور گھور کر دیکھ رہے تھے میں ان کی نگاہوں سے بچتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ آج مجھے پورا یقین تھا کہ وہ عورت نظر نہ آئے گی۔ بھلا اس وقت وہ کیا کرے گی اگر بہ ایک دن وہ مجھے دوپہر کو ملی تھی۔ او پھر ایک صبح ملی تھی۔ وہ شام کو یہاں کس طرح آ سکتی تھی۔ میں چلتے چلتے اسی اڈے کے قریب پہنچ گیا۔ ٹرامیں کھڑی تھیں۔ مسافر بہت کم تھے۔ میں نے چڑھنے کی کوشش کی۔ لیکن میرے قدم پھڑک گئے۔ یونہی خیال آیا کہ وہ عورت کہاں ہو گی اور میں نے پھر ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ جیسے کوئی کسی گم شدہ چیز کو تلاش کر رہا ہو۔ یکا یک سیری نگاہیں بجلی کے کھمبے کے قریب جا کر اٹک گئیں۔ سیری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ عورت اسی کھمبے کے قریب کھڑی تھی۔ میں نے عورت کی طرف دیکھا اور عورت نے سیری طرف عورت کی نگاہوں میں چمک پیدا ہوئی۔ ایک شعلہ بلند ہوا۔ جیسے حتماً کے دو پتھروں کے ٹکرا جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور میں جلدی سے ایک طرف کو ہو گیا میں نے دیکھا عورت کی نگاہوں میں ادا سی آگئی تھی۔ وہ چمک غائب ہو گئی تھی۔ اور وہ مری ہوئی نگاہوں سے مسافروں کو دیکھنے لگی تھی مسافر آ رہے تھے اور چوڑھ رہے تھے۔ اس وقت مسافر بہت کم تھے۔ اور خاص کر اس حلقے میں روشنی بہت کم تھی۔ تاریکی زیادہ تھی۔ میں عورت کو اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ لیکن عورت مجھے نہ دیکھ سکتی تھی میرے

دل میں خیال آیا کہ اس سے جا کر ملوں۔ باتیں کروں اور پوچھوں کہ وہ کیا چاہتی ہے وہ اتنی اداس کیوں رہتی ہے۔ آج میری حیب میں روپے تھے۔ اور میں نے سوچا کہ یہ روپے اسے جا کر دیدوں۔ اور کہوں آج کی رات گھر جا کر چپکے سے سو جاؤ۔ کسی گلاب کا انتظار نہ کرو۔ کسی مرد کا انتظار نہ کرو۔ عورت کبھے کے قریب اکیلی کھڑی تھی۔ اب اس نے اپنی پیٹھ میری طرف کرنی تھی۔ اور میں سوچ رہا تھا کہ وہ کیا سوچ رہی ہوگی۔ اس کی نگاہوں میں کیا تھا۔ اس کے دل میں کیا تھا۔ وہ کیوں لوگوں کی طرف بار بار دیکھتی ہے۔ اس کا جسم کیوں تپلا اور دُبلا ہے۔ اس کی آنکھوں میں چمک کیوں نہیں۔ اس کی چال میں توانائی کیوں نہیں۔ اس کے لبوں پر مسکراہٹ کیوں نہیں۔ وہ کیوں ہر صبح ہر دوپہر ہر شام اس شہر کے سب سے بڑے بار و نق بازار میں آتی ہے جہاں صرف شرفار کا گزر ہوتا ہے۔ جہاں صرف امیڑں کا گزر ہوتا ہے۔ جہاں حالتین عمارتیں ہوتی ہیں۔ شاندار ہوٹل ہوتے ہیں۔ جہاں لوگ کاروں میں بیٹھ کر بازار کی رونق دیکھتے ہیں۔ میرے دل میں رہ رہ کر یہ خیال آ رہا تھا کہ یہ چند سکے اسے جا کر دیدوں۔ اور اس سے کہوں کہ آج رات آرام اور چین سے گزارو اور خاموشی سے اپنے کمرے میں جا کر سو جاؤ۔ اس کا کمرہ کہاں ہوگا۔ وہ سوتی کہاں ہوگی۔ میں نے سوچا اور یکایک یہ خیال میرے ذہن میں کوندا کہ اگر آج میں نے اسے روپے دیدے تو وہ کل کیا کرے گی۔ پرسوں کیا کرے گی۔ اترسوں کیا کرے گی۔ میری ایک دن کی خیرات سے اسے کیا فائدہ پہنچے گا۔ یہ اس مسئلہ کا حل نہ تھا۔ اسے پھر اس بازار میں آنا ہوگا۔ اور اپنے جسم کو فروخت کرنا ہوگا۔ اس خیال کے آتے ہی میری گرفت روپوں پر سخت ہو گئی۔ اور مجھے اپنی غربت کا احساس ہونے لگا اور میں نے نگاہیں موڑ لیں

لیکن نگاہیں پھر اسی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ وہ گھر کیوں نہیں جاتی۔ وہ یہاں کیوں کھڑی ہے۔ کیوں بار بار مسافروں کی طرف دیکھ رہی ہے۔ مجھے اس عورت کو اس حالت میں دیکھ کر غصہ آ رہا تھا۔ اور میرا جی چاہ رہا تھا کہ میں یہاں سے چلا جاؤں عجیب قسم کی بدکار عورت ہے۔ جسے روپوں کے لئے اپنا جسم بیچنا پڑتا ہے۔ اور رتی بھر شرم محسوس نہیں کرتی اور پھر مجھے ہن بات کا خیال آیا۔ کیا اس کو رۓ ارض پر کوئی ایسا ملک ہے جہاں عورتوں کو اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اپنا جسم بیچنا نہیں پڑتا اور ذہن پر دباؤ ڈالنے کے بعد مجھے خیال آیا کہ ہاں ہے۔ واقعی ہے۔ میں نے اخباروں میں پڑھا تھا۔ میں نے کتابوں میں پڑھا ہے۔ کہ اس ملک سے بہت دور ایک اور دیس ہے جہاں خوب برف پڑتی ہے اور سردی ہوتی ہے۔ جہاں مزدوروں اور کسانوں کی حکومت ہے۔ سنا ہے کہ اس دیس میں عورتوں کو اپنا جسم بیچنا نہیں پڑتا۔ جہاں عورتیں ان پڑھ نہیں ہوتیں۔ مردوں کی غلامی نہیں ہوتی۔ جہاں وہ بھی دفتروں میں کام کرتی ہیں۔ ہوائی جہاز چلاتی ہیں۔ فوج میں کام کرتی ہیں۔ ان کی صحت اچھی ہوتی ہے وہ محنت کرتی ہیں۔ شادی کرتی ہیں۔ بچے پیدا کرتی ہیں اور بڑے فرے سے زندگی بسر کرتی ہیں۔ وہ دیس یہاں سے کتنا دُور ہے۔ کیا وہ نظام یہاں نہیں آسکتا۔ اور یکایک مجھے یہ خیال آیا کہ میں جا کر اس عورت سے کہوں۔ کوئی بات نہیں! کوئی بات نہیں!! وہ دن دُور نہیں۔ جب تمہیں اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اس اڈے پر نہ آنا ہوگا۔ اپنا جسم نہ بیچنا ہوگا۔ اور دیس والے تمہاری عزت کریں گے تمہیں کام دیں گے۔ تمہیں روٹی دیں گے۔ تمہارے بچوں کو دودھ دیں گے۔ روت میری بہن۔ وہ دن ضرور آئے گا جب تمہاری آنکھوں میں آنسو نہ ہوں گے۔ جب

تھکے رخساروں پر جھانپاں نہ ہوں گی۔ بلکہ شفق کی لالی ہوگی۔ جب تیرے ہونٹوں پر سُرخ کی جگہ اصل خون دوڑے گا۔ جب تیرا سینہ گوشت سے بھرا ہوا ہوگا۔ جب تیرے کوٹھوں میں کشش ہوگی اور جب تیری آنکھوں میں یاسیت کی جگہ اُستید کے چراغ جھلکائیں گے۔ جب لوگوں میں اتنی طاقت آجائے گی کہ وہ نفع خوردوں اور بلیک مارکیٹوں کے ہاتھوں سے طاقت چھین لیں گے۔ اور اس دُور والے دس کی طرح نظامِ حکومت قائم کریں گے۔ رومت میری بہن۔ اسرا کیلی رات میں اکیلی نہ رہو۔ اور میں یہ سوچتا ہوا خاموش ہو گیا۔ کیونکہ دہن میں یہ خیال بھی آ رہا تھا کہ جب تک وہ نظام نہیں آتا تب تک وہ کیا کرے۔۔۔ تب تک وہ کیا کرے۔ یہ سوچ کر میں ٹرام میں بیٹھ گیا۔ اور ٹرام اپنی منزلِ مقصود کی طرف بڑھی۔ میں نے کھبے کی طرف نگاہ اٹھائی۔ کھبیا اکیلا کھڑا تھا۔ اور عورت وہاں سے جا چکی تھی۔

ادب لطیف
سالنامہ

ہنسراج دھبہ

ماحول

تھارا وہ خط ملا جس میں تم نے صرف ایک فقرہ لکھا ہے۔ ”آئندہ، کیا تم زندہ ہو؟“
 ہاں، میں زندہ ہوں اور اپنے ماحول سے زیادہ زندہ ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں
 تمہیں غصہ سے خط نہیں لکھ سکا۔ ورنہ تم جانتے ہو کہ خط لکھنے میں تساہل سے کام
 نہیں لیتا۔ ہر خط کا جواب دینا میں نے اپنی عادت بنالی ہے۔ پھر تم سے خط و کتابت
 کرنا تو خوشی کی بات ہے۔ تمہارا خط پا کر میں کھل اٹھتا ہوں اور تمہیں خط لکھ کر ایک
 راحت سی نصیب ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ میں تمہیں اپنی بابت سب کچھ یوں لکھ دیتا
 ہوں کہ جیسے اپنے دل کی بات اپنے آپ سے کہہ رہا ہوں۔ مجھے ذرا بھی تذبذب نہیں
 ہوتا۔ یہ سوچنا ہی نہیں پڑتا کہ یہ باتیں پڑھ کر تم میرے متعلق کیا خیال کرو گے؟
 تمہیں محض راضی خوشی تو لکھنا نہیں ہوتی۔ وہ سب کچھ لکھنا ہوتا ہے جو خط لکھتے
 وقت میں محسوس کر رہا ہوتا ہوں اور ان دنوں میں جو کچھ محسوس کر رہا ہوں وہ اس قدر
 زیادہ ہے کہ ایک نہیں دس خط لکھے جاسکتے ہیں۔ کئی مرتبہ ارادہ بھی کیا ہے لیکن ہر
 مرتبہ ناکام رہا۔ — چند سطریں لکھنے کے بعد اگلا کراٹھ بیٹھتا ہوں (جو کچھ مجھے کہنا

ہوتا ہے کہ نہیں پاتا۔ ہر لفظ بیگانہ اور اجنبی معلوم ہوتا ہے۔ میں وہی ہوں۔ تحریر وہی ہے۔ لیکن الفاظ کی بنیاد ایسی بھدی اور مکروہ نظر آتی ہے جیسے میرے خیالات نے میرے خلاف کوئی سازش کر رکھی ہو اور وہ ان الفاظ میں بیٹھے میرا منہ چڑا رہے ہوں۔

کھانا تو درکنار ان دنوں تو پڑھنا بھی محال ہے۔ مارکسزم اور لینن از مہ کی کتابیں بند کر کے الماری میں رکھ دی ہیں۔ سوچا فلسفہ ذہن قبول نہیں کرتا۔ شاعری ہی سے جی بہلاؤں۔ لیکن یہ تمہیں سن کر تعجب ہو گا کہ غالب کا دیوان کھلا پڑا رہتا ہے اور میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا کرتا ہوں جیسے اس کے سب اشعار بے معنی ہوں ان میں کوئی کیفیت، کوئی نشاط نہ ہو۔ بس بیٹھے رہنے، چپ چاپ اور بے کاری بیٹھے رہنے کو جی چاہتا ہے، اپنے آپ سے اور ماحول سے بے نیاز ہو کر جیسے ایک غیر مرئی جسم خلا میں معلق ہو۔

اب تمہیں بتاؤ کہ جو آدمی خلا میں معلق رہتا ہے وہ خود کیا لکھے گا؟ گو میرا جسم مادی ہے۔ جس کرسی پر میں بیٹھا ہوں اس کے بازو اتنے ہی ٹھوس ہیں جتنی کاٹھ کی بنی ہوئی کوئی شے ہو سکتی ہے۔ سامنے میز ہے۔ میز پر جو چیزیں پڑی ہیں وہ بھی مادی اور ٹھوس ہیں۔ کمرہ ہے۔ کمرہ کی دیواریں ہیں۔ گلی ہے اور گلی کے لوگ ہیں اور ان سب کے متعلق بہت سے خیالات میرے ذہن میں پیدا ہو رہے ہیں۔ بس ان خیالات کے باوجود میں سوچتا ہوں اور اس سوچ میں یوں کھوجاتا ہوں جیسے خلا میں تیر رہا ہوں۔ یہ میری کیفیت ہے۔ اب یہ تم جانو کہ میں مردہ ہوں یا زندہ۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ جو آدمی سوچ سکتا ہے وہ کچھ نہ کرتے ہوئے بھی زندہ ہے جانے وہ کب غل پر آمادہ ہو جائے۔

مجھے تمہارے اس خط کے الفاظ بھی یاد آرہے ہیں جو تم نے میرے بنارس سے لوٹنے کے بعد لکھا تھا۔ ”جب تم ماحول کو موافق نہیں پاتے تو تمہاری باغی روح چیخ اٹھتی ہے وہ تمہیں کہیں چین سے بیٹھنے نہیں دیتی اور تم بھاگ کھڑے ہوتے ہو“ تمہاری بات کافی حد تک درست ہے۔ لیکن دوست بھاگ کر آدنی جائے کہاں؟ ہر جگہ وہی ماحول ہے۔ وہی لوگ ہیں۔ وہی ہندوستان ہے۔ میں بھاگتے بھاگتے تھک گیا ہوں۔ اب یہی سوچا ہے کہ اس ماحول کو سمجھوں۔ ان لوگوں کو سمجھوں۔ ان کے شکوک، نفرت اور محبت کو سمجھوں۔ پھر شاید چینے کی کوئی بہتر صورت نکل آئے۔

اب تک میں نے تھوڑا بہت سمجھنے کی کوشش کی ہے تو یہ محسوس کیا ہے کہ ان کی نفرت اور محبت میری نفرت اور محبت سے مشابہ ہے اور ان کی روحیں بھی میری روح کی طرح باغی ہیں ہم سب اس ماحول سے بیزار ہو کر ادھر ادھر بھاگتے پھرتے ہیں اور تیز تیز قدموں سے کسی ایک ہی منزل کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

یہ خیالات ہیں جو اس وقت میرے ذہن میں اُٹھ رہے ہیں اور متواتر اُٹھتے رہتے ہیں اور ان کے پس منظر میں وہ ماحول ہے جس میں اب رہتا ہوں۔ اور وہ لوگ جو اس ماحول کو بنانے والے ہیں۔ تم یقیناً اس ماحول اور ان لوگوں کی ایک جھلک دیکھنا پسند کرو گے۔ اس کے بغیر میرے موجودہ خیالات اور میرے ذہنی رجحان کو تم سمجھ نہیں سکو گے۔

صبح سویرے بہت سویرے میری آنکھ اچانک کھل جاتی ہے۔ کیونکہ جب ابھرنے کے شور سے سارا ماحول جاگ اٹھا ہو تو آدمی خواہ کتنا ہی نیند کا ماتا کیوں نہ ہو اس کے

لئے سوئے رہنا ممکن نہیں۔ صبح جب طبیعت سکون ڈھونڈھتی ہے میں تیز تیز چنیں
سننے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔

گلی کے دوسری طرف سامنے جو گھر ہے اس میں دولڑکے رہتے ہیں ان کی
عمر دس اور چودہ سال کے درمیان ہے۔ جسم چھریہ۔ رنگ گندمی اور کپڑے
میلے ہیں۔ وہ علی الصبح اٹھ کر کبوتر اڑاتے ہیں۔ انھیں آسمان میں اڑتے اور قلابازیاں
لگاتے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ اچھل اچھل کر چختے ہیں۔ جیسے ان کی چنیں آسمان تک
پہنچ جائیں گی۔ کبوتروں تک ان کا پیغام مسرت لے جائیں گی انھیں اور اونچا اڑنے
میں مدد دیں گی۔!

جب کوئی کبوتر ان کی چھت سے اٹھ کر اوپر اڑنے کی بجائے کسی قریب کے مکان پر
جا بیٹھتا ہے تو وہ دونوں لڑکے بیک وقت ہا ہو ہا ہو چلانا شروع کر دیتے ہیں بتا لیا
پیتے ہیں اگر کبوتر پھر بھی نہیں اڑتا تو کنکر بھینکتے ہیں۔ اس کنکر بھینکنے پر کئی مرتبہ جھگڑا پیدا
ہو گیا ہے۔ کل ہی وہ موچی ان کے گھر میں گھس آیا تھا اور گرج کر کہا تھا، ”بدمعاش!
سور! سارا محلہ سر پر اٹھائے رکھتے ہیں۔ اب کنکر بھینکا تو کھال اُدھیر ٹوں گا“

باپ نے بیٹوں کو خوب مارا۔ لیکن وہ دوسرے دن پھر کبوتر اڑا رہے تھے۔
پھر کنکر بھینک رہے تھے۔ یہ مار تو موچی کا غصہ دور کرنے کے لئے پڑی تھی۔ لیکن جب
باپ کو خود غصہ آتا ہے تو وہ انھیں اتنا مارتا ہے۔ اتنا مارتا ہے کہ دیواریں تک
کانپ جاتی ہیں۔ ماں کا بھی یہ حوصلہ نہیں پڑتا کہ درمیان میں پڑ کر بیچ بچاؤ کر دے۔
شاید وہ بیچ بچاؤ کرنا ہی نہیں چاہتی ہے۔ چپ چاپ اپنے کام میں مصروف رہتی ہے
جیسے یہ کربہ منظر دیکھنے کی عادی ہو چکی ہو۔ جب خود اس پر مار پڑتی ہے تو کون

بیچ بچاؤ کرنے آتا ہے۔ مار کھاتے کھاتے اس کی پسلیاں پک چکی ہیں اور جب ماں کو غصہ آتا ہے تو وہ گود کے بیچے پر برس پڑتی ہے۔ اسے پیٹ پیٹ کر اودھوا کر دیتی ہے۔ یہ دونوں لڑکے جب آپس میں لڑنے پر آتے ہیں تو لڑتے ہی رہتے ہیں۔ باپ گھر میں موجود نہ ہو تو قیامت برپا کر کے چھوڑتے ہیں۔ ماں بیچاری منہ تاکتی رہ جاتی ہے اسے گلہ ہے کہ موئے جوان ہونے سے پہلے ہی ہاتھ سے مٹل چکے ہیں۔

اس گھر میں غصہ کسی سے بھی سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ جیسے وہ غصہ کرنے کو اکٹھے ہوئے ہوں اور غصہ کر کے جی رہے ہوں۔

باپ گلی کے باہر پانی کی سبیل کے قریب جو ٹال ہے اس پر لکڑیاں پھاڑتا ہے اور انھیں اٹھا کر گاہکوں کے گھر چھوڑ آتا ہے۔ لڑکے کوئلے کی دوکان پر کام کرتے ہیں دن بھر دوکاندار کی گھر کیاں اور گاہکوں کا عتاب سہتے ہیں۔ صرف گھر ہے جہاں انھیں ایک دوسرے سے برابری کا درجہ حاصل ہے۔ گھر ہے جہاں اپنے دل کی گھٹی گھٹی حسرتوں کا اظہار کر سکتے ہیں۔ یہی حسرتیں جو چنچوں کی صورت اختیار کر لیتی ہیں آسمان میں اڑنا چاہتی ہیں۔

شروع شروع میں میں بھی ان لڑکوں پر ناراض ہوتا تھا اور انھیں چنچنے سے منع کرتا تھا۔ لیکن اب جب یہاں رہتے کافی عرصہ ہو گیا ہے منع کرنے کو جی نہیں چاہتا۔ چپ چاپ چار پائی پر بیٹھے انھیں چنچنے سننا رہتا ہوں۔ ان چنچوں کا منہ ہوم روح میں بھر لینا چاہتا ہوں۔ جانے کیوں۔ اب یہ چنچیں بری لگنے کی بجائے پیاری لگتی ہیں۔ کئی مرتبہ جی میں آتا ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ مل کر بو تراٹاؤں۔ اور گلا بھاڑ بھاڑ کر چلاؤں۔ ہا ہو! ہا ہو!

جب یہ لڑکے کبوتر ڈربے میں بند کر کے کام پر چلے جاتے ہیں تو بھی شور بند نہیں ہوتا۔ گلی میں کوئی نہ کوئی ہنگامہ برپا رہتا ہے۔ سامنے کے موٹر پر میونسپل کمیٹی کا نل ہے۔ جو چوبیس گھنٹے چلتا رہتا ہے اور اس پر ہر وقت پانی بھرنے والوں کی بھڑکی لگی رہتی ہے۔ بالٹی سے بالٹی اور برتن سے برتن کھنکتا ہے۔ پانی بھرنے والوں کی آپس میں تھکار رہتی ہے پہلے، پیچھے آئے ہوؤں میں جھگڑا رہتا ہے۔ کوئی نہاتا ہے۔ کوئی کپڑے دھوتا ہے۔ نل کے قریب ایک چھوٹے سے کمرے میں جمعداری رہتی ہے۔ اس کا نام پاربتی ہے۔ لیکن سب لوگ اسے جمعداری کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا گھر والا جمعدار ہے میونسپلٹی میں ملازم ہے۔ نیلا صاف، نیلا کرتہ اور نیلا پانچاما پہنتا ہے۔ جمعداری کا یہ دوسرا خاوند ہے۔ بچارے کو پچھلی عمر میں عورت نصیب ہوئی ہے۔ عمر تو دونوں کی برابر ہی ہوگی لیکن جمعداری ہی ہٹی گئی ہے، وہ اس کے مقابلہ میں بالکل دبلا پتلا اور مرل نظر آتا ہے۔ میں نے اسے کبھی بات کرتے نہیں دیکھا جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔ کمرے کے ایک کونے میں بیٹھا حقہ گرگڑایا کرتا ہے اس کے برخلاف جمعداری ہر وقت گرجتی رہتی ہے۔ لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ اگر اسے کبھی نل سے پانی لینا ہو تو سب سے پہلے بھرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ”میں صاحب سے شکایت کروں گی اور نل بند کرادوں گی“ لوگ نل بند کرانے کی دھمکی سے تو نہیں ڈرتے مگر اس کی چربے بانی سے ضرور ڈرتے ہیں۔ ویسے نل بند کرنا وہ خود بھی نہیں چاہتی۔ اسے تو محض یہ جتنا ہوتا ہے کہ نل میونسپلٹی کا ہے اور میرا جمعدار میونسپلٹی کا ملازم ہے اس لئے نل پر سب سے زیادہ حق میرا ہے۔

اس خاوند سے جمعداری کی ایک لڑکی لٹی ہے، جس کی عراب سولہ سترہ

سال کے قریب ہے لیکن نیر، نقش جاذب نظر ہیں۔ جمعدارنی قلعہ میں صفائی کے لئے جاتی ہے۔ اس کے ہمراہ یہ لڑکی بھی جاتی ہے۔ اس کا بڑی لڑکی جمیا بھی جو پہلے خاوند سے ہے اسی گلی میں رہتی ہے۔ اس کا گھر دالا کام پڑ جاتا ہے اور وہ چار پائی بچھا گلی میں بیٹھی رہتی ہے۔ رنگ گورا جسم بھرا ہوا اور سڈول ہے۔ میرے ایک دوست نے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ ”اگر بہن ادٹھ کر رہے تو بگیم نظر آئے“

ماں بیٹی — جمعدارنی اور جمیا میں اکثر لڑائی رہتی ہے۔ جمیا نل پر آئی نہیں کہ لڑائی شروع ہوئی نہیں۔ اور ایک دفعہ شروع ہو کر جلد بند ہونے میں نہیں آتی۔ دونوں ایک دوسرے کو کوستی ہیں۔ یہودہ اور غلیظ گالیاں دیتی ہیں اور ان گالیوں کو زیادہ تیز اور ترش بنانے کے لئے گٹھے کی تمام قوت صرف کر دیتی ہیں۔ دونوں کے جبرے غصے سے تمٹانے لگتے ہیں اور ہونٹوں سے جھاگ نکل آتے ہیں۔ جمیا جب ماں کی ترشی برداشت نہیں کر سکتی تو وہ اسے سخت سے سخت گالی دیتی ہے۔ تلی کی طرف اشارہ کر کے کہتی ہے۔ ”بیٹی کی کماٹی کھانے والی تو کیا بولنے پر مرتی ہے۔ چلو بھریانی میں ڈوبے“ جمعدارنی جھنجھلا اٹھتی ہے اور نوبت ہاتھ پائی پر آ جاتی ہے۔ دونوں گتھم گتھا ہو جاتی ہیں تلی کھڑی گہری سیاہ آنکھوں سے دیکھتی رہتی ہے۔ دیکھتی رہتی ہے۔ اس نے ماں یا بہن کے حق میں کبھی ایک جملہ نہیں کہا۔ منع بھی نہیں کیا۔ ہاں، جمعدار اگر گھر پر ہوتا ہے تو حقہ چھو کر باہر آ جاتا ہے، انھیں الگ الگ کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی پیش نہیں جاتی۔ ہتھنیوں کی دھکم پیل کے سامنے بکرے کی اچھل کود کیا معنی؟

جمیا کو میں نے گلی کے اور کسی آدمی سے کبھی لڑنے نہیں دیکھا۔ چپ چاپ گھر میں بیٹھی رہتی ہے۔ ننھے سے کھیلتی ہے۔ اگر کسی کو بات دریافت کرنی ہو تو نہایت حلیمی

جواب دیتی ہے۔ پڑوس میں جو خاتون رہتی ہے اس کے ساتھ اس کی گہری چھٹی ہے۔ وہ اپنے دل کا راز بھی اس سے کہتی نہیں جھکتی۔ ایک دن جب وہ ماں سے لڑ جھگڑ کر آئی تھی تو خاتون سے کہہ رہی تھی جب میں چوٹی تھی تو یہ چڑیل مجھے اتا مارتی تھی۔ اتنا ماتی تھی کہ میری رگ رگ دکھنے لگتی تھی اور روتے روتے گھگی بند جاتی تھی اور جب میں ٹی کی عمر کی تھی تو میری بربات پر شک کرتی تھی اور مجھے گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتی تھی۔ اگر کہیں اس کے ساتھ بھی جانا ہوتا تو رستہ پہنا مشکل کر دیتی خواہ مخواہ کڑک کر کہتی کہ میں ادھر ادھر کیوں دیکھتی ہوں۔

لیکن اب جمیا غود مختار ہے۔ اس کا اپنا گھر ہے خاوند ہے بچے ہے۔ وہ ماں کی ایک نہیں مانتی بلکہ موقع بے موقع اسے چڑانے کی کوشش کرتی ہے۔ جیسے وہ اس سے لڑنا چاہتی ہے۔ وہ جب لڑ کر لوٹتی ہے تو اس کے چہرے پر اطمینان کی ایسی جھلک ہوتی ہے جیسے اس کی روح کا کوئی زخم مندمل ہو رہا ہو۔

خاتون دہلی پتی عورت ہے۔ بات سنبھی ہوئی اور مختصر کرتی ہے۔ سینا اور پرونا کر کے اپنا اور اپنی بیٹی کا پیٹ پالتی ہے وہاں اس کی طرح دہلی پتی اس کی ایک لڑکی ہے۔ عمر بارہ تیرہ سال ہوگی۔ وہ محلہ کے بچوں سے مل کر کھیل کر رہتی ہے۔ خاتون کا لگے پیچھے اور کوئی نہیں، بس یہ بیٹی ہے اور وہ اسے اپنی روح کی طرح پیار کرتی ہے۔ اسے کھیلتی کو دتی دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ لیکن لگی کے ادھر ادھر محلہ میں قدامت پسند اور پرانی وضع کے لوگ بستے ہیں، انھیں بڑی لڑکی کا کھیلنا کو دنا برا لگتا ہے۔ چار پانچ روزہ ہوئے کہ شام کی سیر سے لوٹ رہا تھا دیکھا کہ خاتون کے گھر کے سامنے جمع لگا ہوا ہے اور گرم گرم گفتگو ہو رہی ہے۔ گفتگو کا موضوع تھی خاتون کی بیٹی! خاتون بیٹی

سنٹی رہی اور سن کر بولی۔ ”آپ بتائیں میں اس بے چاری کو کس طرح سارا دن اس اندھیری کوٹھری میں بند رکھوں۔“

اس کا گھرتنگ و تاریک اندھیری کوٹھری ہی تو ہے۔ لیکن محلہ والوں کو اس کی یہ دلیل کچھ حجتی نہیں۔ ان کے ترجمان نے کہا۔ ”ہمارا کیا ہے۔ ہم تو تمھارے بھلے ہی کی کہتے ہیں۔ اس طرح پھرے گی تو جوان لڑکی چوہٹ ہو جائے گی۔“

خاتون اور جمیا کے گھر کے سامنے بننے کی دکان ہے۔ دوکان کا چبوترہ گلی سے کافی اونچا ہے۔ بنیا اس چبوترے پر چوڑی مارے یوں بیٹھا رہتا ہے جیسے جھیل کے کنارے بگلا۔ گاہک کے علاوہ وہ کسی سے بات نہیں کرتا۔ چائے کی پُیا جو سوڈیٹھ سو قدم چل کر بازار میں چار آنے کو ملتی ہے وہ ساڑھے چار آنے میں دیتا ہے۔ کوئی اعتراض کرتا ہے تو وہ جواب دیتا ہے۔ ”ان کے پاس تھوک کھنسی ہے۔ انھیں مال سستا ملتا ہے۔“ اسی طرح وہ بازار سے ہر چیز منگی دیتا ہے اور اکثر ہر چیز منگی ہی نہیں بلکہ گھٹیا اور خراب بھی ہوتی ہے۔ لیکن اسے گلی والوں سے گلہ ہے کہ وہ بازار میں چیز خریدنے کیوں جاتے ہیں؟ بکری زیادہ ہو تو وہ بھی اچھی اور سستی چیزیں مہیا کر سکتا ہے۔

میں نے اسے صرف ایک مرتبہ چبوترے کے نیچے گلی میں کھڑے دیکھا تھا اور وہ ایک لڑکے پر اس لئے ناراض ہو رہا تھا کہ اس نے اس کی دھوئی کو کیوں چھو لیا؟ اس کی آنکھیں چھوٹی چھوٹی اور سر گھٹا ہوا ہے۔ جب میں اسے دیکھتا ہوں تو کراہتی محسوس ہوتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ چھینٹا چلا تا کیوں نہیں۔ جیسے وہ ماحول کا حصہ نہیں۔ اس گلی کا فرد نہیں۔

بنی کی دوکان کی بغل میں ایک بڑھیا کی دوکان ہے۔ وہ بھولی کہلاتی ہے شاید اس کے متعلق بس یہی ایک بات دلچسپ ہے۔ وہ دو تین مکانوں کی مالک ہے۔ اکیلی جان ہے ان کا کرایہ کھاتی ہے۔ دوکان معن شغل کے طور پر کھول رکھی ہے گلی میں اس کا چرچا کبھی اتنا بھی نہیں ہوتا جتنا میں نے اس کی بابت لکھ دیا ہے۔ اس سے آگے ہماری جمعدارنی کا مکان ہے۔ ہماری جمعدارنی اس لئے کہ وہ ہمارے ہاں صفائی کے لئے آتی ہے۔ وہ نہایت اہم اور دلچسپ کردار کی مالک ہے۔ ہتھنی کی طرح جھوم کر چلتی ہے۔ جب بولتی ہے تو اس کے لہجے میں تکنت ہوتی ہے۔ جیسے سارے محلہ پر حکومت کر رہی ہو۔ ہم کہتے تھک گئے کہ صفائی جلد کر جایا کرو۔ لیکن وہ بارہ ایک بجے سے پہلے کبھی نہیں آتی۔ اسے اس بات کا ذرا برا بھی ڈر نہیں کہ اسے کام سے ہٹا دیا جائے گا۔ کیونکہ وہ جانتی ہے کہ کوئی دوسری بھنگن اس کی جگہ کام کرنے کو تیار نہیں ہوگی، اگر ہوں تو ناخنوں سے پھاڑ کھائے ہم نے اس کا نام چاچی تار کا رکھ چھوڑا ہے۔

گذشتہ ہولی کے روز چاچی تار کا نے جی بھر کر شراب پی۔ گھونٹ گھونٹ بچوں کو بھی پلائی اور انھیں ساتھ لے کر رات بھر ناچتی رہی جو جی میں آیا کرتی اور چلاتی رہی کسی کی ہمت نہیں تھی کہ اسے منع کرے۔

چاچی تار کا تین بچوں کی ماں ہے۔ سب سے بڑا لڑکا ہے۔ عمر سات آٹھ سال ہے۔ جب وہ شرارت کرتا ہے تو چاچی تار کا لال لال آنکھیں نکال کر کہتی ہے۔ ”حرام کے تخم نچلا نہیں بیٹھتا“ ان گھڑکیوں کے باوجود وہ نچلا بیٹھے کا عادی نہیں۔ جب چاچی تار کا گھر پر نہ ہو تو چھوٹی بہن کا سر بازوؤں میں لے کر پیچھا ڈالتا ہے

اور اسے چلاتے دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اس چھوٹی لڑکی کی عمر چار ایک سال سے ڈیڑھ دو سال کی اور موتی سوکھی سی بچی چاچی تاڑ کا کی گود میں ہے۔ جب چاچی تاڑ کا اُسے اپنے پیٹ پر بٹھائے لگی میں لیٹی ہوتی ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے بھینس کے جسم پر منڈک بیٹھا ہے۔

ایک اور لڑکی بتو جس کا دس بیس روز میں بیاہ ہونے والا ہے۔ وہ چاچی تاڑ کا کی لڑکی نہیں اس کے خاوند کی لڑکی سے پہلی بیوی سے پیدا ہوئی تھی۔ خاوند بیچارے کی اہمیت اتنی بھی نہیں جتنی گھر میں بیٹھ کر حقہ پینے والے جمعدار کی شاید اس لئے کہ وہ میونسپلٹی کا ملازم نہیں۔ شاید اس لئے کہ چاچی تاڑ کا نے اس کی کسی بات پر فخر نہیں کیا۔ شاید اس لئے کہ چاچی تاڑ کا کا کردار جمعدار کی سے نمایاں ہے اور وہ اس کے پیچھے بالکل چھپا رہتا ہے۔

لیکن بتو ایک ابھرتے ہوئے کردار کی مالک ہے۔ وہ چاچی تاڑ کا کے پیچھے چھپنا پسند نہیں کرتی۔ وہ اکثر ہمارے ہاں صفائی کرنے آیا کرتی ہے میں نے ایک دفعہ اس سے کہا تھا کہ جمعدار کی تو نہیں مانتی خدا کے واسطے تمہیں جلد آجایا کروہیں سخت تکلیف دیتی ہے۔ بتو نے جلدی سے کہا تھا۔ ”میرے بس کی کیا بات ہے۔ میں تو گولی ہوں اس کی“

اور پھر اس نے جن آنکھوں سے میری طرف دیکھا تھا ان میں دردناک داستان بھری ہوئی تھی۔ بتو کا چہرہ ہتلا دہلا اور قدرے ترچھا ہے۔ لیکن آنکھیں بڑی بڑی ہیں۔ ان میں کوئی عجیب جادو سے جوان آنکھوں ہی کو نہیں بلکہ بتو کو بھی حسین بنا دیتا ہے۔ جب وہ انھیں پورا کھول دیتی ہے تو جی چاہتا

ہے کہ آدمی انہیں دیکھتا ہی جائے۔ ان میں ڈوب کر اس داستان کا راز معلوم کر لے۔

ڈیڑھ دو ماہ پہلے بتو کے ساتھ ایک لڑکا اندر آیا کرتا تھا وہ دونوں بل کر گھروں میں صفائی کرنے جاتے تھے اس وقت ہماری اس بلڈنگ میں آبادی اتنی گنجان نہیں تھی۔ عورت کوئی تھی سب مرد تھے وہ کام پر چلے جاتے تھے۔ میں اپنے کمرہ میں بیٹھا لکھا پڑھا کرتا تھا۔ میرے علاوہ با درچی ہوتا تھا وہ دونوں خوب چہل بازی کیا کرتے تھے۔ ہماری کھلی چھت پر اچھلتے کودتے تھے کبھی بتو آگے ہوتی تھی اور اندر اسے پکڑنے کی کوشش کرتا تھا اور کبھی اندر آگے بھاگتا تھا اور بتو اسے مارنے دوڑتی تھی۔ با درچی کھڑا ہنسا کرتا کرتا تھا، اور میں چپ بیٹھا دیکھا کرتا تھا۔

چاچی تارکا کو شک ہے کہ بتو سارے محلہ سے عشق لڑاتی ہے۔ وہ اس پر کڑی نگاہ رکھتی ہے اور اسے گھورتی ہے۔ جب بتو خفا ہو کر اس کی طرف سے بکھتی ہے تو وہ جل بھن کر ترش لہجے میں کہتی ہے۔ ”کیا گھورتی ہے آنکھیں نکال لوں اپنی سوت کی۔“

آنکھیں نکالنے کا یہ فقرہ میں نے چاچی تارکا سے کئی مرتبہ سنا ہے ایک دن تو اس نے سچ جج آنکھیں نکال لینے کی کوشش کی تھی۔ بتو کو خوب مارا تھا۔ وہ سارا دن ہماری دیوار کے نیچے چبوترے پر بیٹھی روتی رہی تھی اور چاچی تارکا کے لاکھ ناراض ہونے کے باوجود کام پر نہیں لئی تھی۔ میں جتنی مرتبہ نیچے اترتا تھا اتنی ہی مرتبہ بتو کو وہیں بیٹھے روتے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اب زیادہ حسین

تھیں اور ان کی کہانی بھی پہلے سے زیادہ دردناک تھی۔ مجھے اس سے ہمدردی پیدا ہوئی اور میں نے چاچی تاڑکا سے کہا۔ ”جمعہ رات کیوں مارتی ہو بے چاری کو۔ صبح سے بیٹھی رو رہی ہے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”بابو جی کیا کروں اپنی دھی بیٹی کے چلن کا تو خیال رکھنا ہی پڑتا ہے۔“

ہم جس بلڈنگ میں رہتے ہیں وہ اس محلہ میں سب سے اونچی اور شاندار عمارت ہے۔ اس لئے محلہ کے لوگ اس عمارت میں بسنے والوں کو اونچے اور مہذب سمجھتے ہیں۔ آؤ تمہیں ذرا ان کی بات بھی بتا دوں۔ مجھے تم جانتے ہی ہو۔ ہر محفل میں اپنے مخالفوں سے لڑنا میرا کام ہے۔ لیکن یہاں میں کسی سے نہیں لڑتا۔ کیونکہ یہاں مجھے اپنا کوئی مخالف نظر نہیں آتا۔

میرے بائیں طرف ایک عورت اور اس کی ساس رہتی ہے۔ عورت دیکھنے میں نہایت غیر دلچسپ معلوم ہوتی ہے۔ جیسے اس میں زندگی کے سب سوتے سوکھ گئے ہوں۔ میں نے اسے کبھی خاوند، دیور اور ساس سے ہنس کر بات کرتے نہیں دیکھا بلکہ ان کے سامنے وہ ایسی رہتی ہے جیسے دیوانی ہو۔ ہاں وہ پڑوسن کے بچے کو اکثر کھلایا کرتی ہے۔ اسے خوش کرنے کے لئے منہ ڈھانپ لیتی ہے پھر پلو اٹھا کر ”جھاں“ کہتی ہے اور مسکرا دیتی ہے۔ عورت کے ہونٹ ڈھیلے ڈھالے اور نیچے کوٹکے ہوئے ہیں اس لئے مسکراہٹ بھی انہیں جاذب نظر نہیں بنا سکتی۔ مگر یہ مسکراہٹ کسی غیر مطمئن اور غیر فانی جذبہ کی ترجمان معلوم ہوتی ہے۔

عمر چالیس سال سے تجاوز کرنے کو آئی لیکن اس کے اپنا کوئی بچہ نہیں۔ شاید اسی لئے وہ ساس کو اچھی نہیں لگتی۔ روز کے جھگڑے نے اس کا جینا اجیرن بنا رکھا ہے

چند روز سے اس نے ساس کی لڑائی سے تنگ آ کر اپنا کھانا پکانا الگ کر لیا ہے
 بائیں طرف سامنے جو کمرہ ہے اس میں ایک بوڑھا اور اس کا کنبہ رہتا ہے
 دراصل اس کنبے کو بوڑھے کا کنبہ کہنا بجا نہیں۔ بلکہ وہ اس کنبہ کا بے کار فرد ہے۔
 دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں اور ان کی ماں ہے۔ بڑا لڑکا ایک فرم میں اکاؤنٹنٹ
 ہے۔ سوا سو روپے تنخواہ ملتی ہے جس سے اتنے بڑے کنبے کا خرچ چلنا ممکن نہیں۔ اس لئے
 ماں کو فکر رہتی ہے کہ اسے برتن مانجھنے، کپڑے دھونے یا اس قسم کا کوئی اور کام مل جائے
 جس سے بیس تیس روپے ماہوار بن جایا کریں اور گھر کا خرچ اچھی طرح چلنے لگے۔ جب
 وہ اپنے گاؤں میں ہوتی تھی تو اسے کام اکثر مل جایا کرتا تھا۔

میں ایک بات کہنا بھول گیا۔ اس عمارت میں جتنے لوگ رہتے ہیں وہ سب خاندان
 کے بھگائے ہوئے ہیں۔ یہ عمارت کسی مسلمان تاجر کی تھی جو کافی امیر تھا اور یہ خاتون
 جو نیچے گلی میں رہتی ہے اس کے ہاں کام کرتی تھی۔ وہ خود پاکستان چلا گیا ہے اور
 خاتون کو ابھی تک دس پندرہ روپے مہینہ وظیفہ بھیجتا ہے۔

یہ کنبہ صوبہ سرحد سے آیا ہے۔ وہاں گھر کا سب خرچ بڑھیا کو خود چلانا ہوتا تھا
 کیونکہ اس کا یہ بڑا لڑکا ایک سیاسی پارٹی کا بڑا سرگرم کارکن تھا وہ سارا وقت اس
 کے لئے وقف کرتا تھا اور اکثر گھر نہیں آتا تھا۔ لیکن اب گھر کی حالت دیکھ کر کسی سیاسی لیڈر
 کی سفارش سے ملازم ہو گیا تھا۔ اس بوڑھے نے ساری عمر کبھی کام نہیں کیا۔ وہ وہاں
 بھی بے کار رہتا تھا۔ یہاں بھی بے کار رہتا ہے۔ ہر وقت اسٹریکچر ناچار پائی پر لیٹا
 لیٹا کھانا کرتا ہے۔ مجھے یہ کھانسی بھیانک اور خوفناک معلوم ہوتی ہے جیسے اس کے
 پیچھے وسیع کھوکھلا پن ہے ایک تھکی ہوئی روح کا کھوکھلا پن۔

گھر والوں نے سوچا تھا کہ وہ بازار میں بیٹھ کر سبزی بیچ آیا کرے۔ دو چار آنے روز تو لائے گا۔ بے کار بیٹھنے سے اچھا ہی ہے۔ پہلے دن جو بھنڈیاں لا کر دی تھیں وہ گھر میں پڑی سڑ گئیں۔ بوڑھا پانچ منٹ بازار میں بیٹھ کر اٹھ آیا اور کہہ-یا مجھ سے نہیں بکتیں۔ جب وہ خود کام کرنا نہیں چاہتا تو کسی کا کہنا سننا فضول ہے۔ گھر والے کڑھ کر رہ گئے۔ بزرگ آدمی ہے۔ کھانا تو دینا ہی پڑتا ہے۔

بوڑھے کی بڑی لڑکی گوماں بیاہی ہوئی ہے۔ اس کا داماد بھی یہیں رہتا ہے وہ کسی لکڑی کے کارخانہ میں ملازم ہے۔ کرسی میزوں پر پالش کرنے کا کام کرتا ہے اور ساٹھ روپے مہینہ تنخواہ ملتی ہے۔ میاں بیوی چھت پر برسائی میں رہتے ہیں کل کسی بات پر جھگڑا ہو گیا وہ طیش میں آ کر بڑے زور زور سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ شہر نہیں کر سکتا کہ عورت مرد کا سامنا کرے۔ اس سے اچھا ہے کہ آدمی مر جائے“

اس آدمی کا نام گورداس رام ہے۔ اگر یہ واقعہ نہ ہوتا تو میں نہیں اس کا نام نہ بتا سکتا۔ اتنے دن یہاں رہتے ہو گئے لیکن اس کوئی واسطہ نہیں پڑا جیسے وہ یہاں رہتا ہی نہ ہو۔ صبح کام پر جاتا ہے۔ رات گئے لوٹتا ہے۔ اتوار کو چھٹی ہوتی ہے تو میاں بیوی اوپر برسائی میں بیٹھے رہتے ہیں۔ تم جلتے ہو ہمارے سماج میں جو آدمی زیادہ شریف ہو اسے گائے کہتے ہیں۔ یہ گورداس رام بیچ بچ گائے ہے۔ کم از کم میں اسے گائے سمجھتا تھا۔ اس کا نام جاننے کی کوشش نہیں کی تھی۔ وہ صبح سر جھکائے جاتا ہے اور شام کو سر جھکائے آتا ہے۔ میں نے کبھی اسے بات کرتے نہیں سنا۔ جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔

مجھے گمان بھی نہ ہوا تھا کہ اسے طیش آ سکتا ہے۔ لیکن اس وقت اس کی آنکھوں

سے شعلے برس رہے تھے اور ہونٹ کانپ رہے تھے گوماں سہمی ہوئی کونے میں کھڑی تھی وہ بے چاری بھی کبھی نہیں بولتی۔ ہر وقت کام میں مصروف رہتی ہے۔ جی جان سے اس گائے کی سیوا کرتی ہے۔ میں نے سمجھا بجھا کر گورداس رام کو ٹھنڈا کیا وہ کھانا درمیان میں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ پھر کھانے بیٹھ گیا۔ لیکن نغمہ منہ میں ڈالنے سے پہلے اندر سے مواد خارج کرنا ضروری تھا۔ وہ بڑبڑایا: ”سارا دن ادھر جان کھپاتے مرجاتے ہیں اور ادھر یہ چین لینے نہیں دیتی۔“

یہ ماحول ہے اور یہ لوگ ہیں۔ اس گلی ہی پر منحصر نہیں۔ سارے محلے میں ایسا ہی مواد بھرا پڑا ہے جو ہر وقت لاوے کی طرح ابلتا رہتا ہے۔ اور ابل کر باہر آنے کے لئے موقع کی تلاش میں رہتا ہے۔ پرے گلی کے نکر پر حنیف میاں کی دوکان ہے۔ تھوڑی دیر پہلے جب میں ادھر سے گزر رہا تھا تو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ ایک برقعہ پوش عورت جو بغل کی گلی سے سودا خریدنے آئی تھی کسی لمبے قد کے ڈاڑھی والے مرد سے لڑ رہی تھی اور مغلف گالیاں دے رہی تھی۔ اتنے لوگوں کے سامنے بے عزتی ہوتے دیکھ کر مرد نے کہا: ”زبان سنبھال رکھو ورنہ“ ”چھو کر کے یا ورنہ کیا ڈاڑھی نوچ لوں گی سو رکھی۔“ وہ گالی بکتی ہوئی بڑھی۔ اور مرد ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ عورت کے دانت پان چباتے چباتے سیاہ ہو گئے تھے اور چہرہ بھدا اور کرخت تھا۔ گالیاں دیتے ہوئے وہ چاچی تاڑکا سے بھیانک نظر آتی تھی۔

صرف چند ایک کس بچے ہیں جو ننگے بدن ادھر ادھر پھرتے رہتے ہیں۔ اور ماحول سے بے نیاز ہو کر رومانی فلمی گانے گاتے ہیں۔ گانے جوان کی زبان پر

چڑھ کر بالکل غلط اور مبہم بن جاتے ہیں مثلاً ابھی ایک لڑکا گاتے ہوئے نیچے سے گزرتا ہے
 ”افسانہ کہہ رہی ہوں دل انتظار کا“ میں کافی دیر تک سوچتا رہا کہ یہ دل انتظار کسی
 ترکیب سے کیا مطلب ہے؟ پھر خیال آیا کہ اس نے دل بیقرار کو دل انتظار بنادیا
 ہے۔ بہر کیف گیت کی رنگینی برقرار رہتی ہے۔ دراصل دل بے قرار بھی تھا اور اسے
 کسی شے کا انتظار بھی تھا۔

تحریر آزادی

شروع شروع میں میں نے کوشش کی کہ ان بچوں کی طرح ماحول سے بے نیاز نہ ہو کر پھنسے
 لکھنے میں معروف رہوں۔ لیکن ماحول سے بے نیاز نہ ہو کر تو گور داس رام بھی نہیں رہ سکتا جو
 گائے ہے۔ پھر میرے لئے بقول تمھارے جس کی باغی روح کہیں چین نہیں لینے دیتی ایسا کہے
 ممکن تھا؟ ماحول میرے تخیل پر اثر انداز ہو رہا ہے اور میرا تخیل ماحول پر اثر انداز ہونے کی
 کوشش کر رہا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ لکھنا پڑھنا بالکل چھوٹ گئی ہے۔ میں سوچتا رہتا
 ہوں اور خلا میں تیرتا رہتا ہوں۔

کیا بتاؤں اس سوچنے اور تیرتے رہنے میں کیا مزا ہے عجیب عجیب خیالات ذہن میں
 اٹھتے ہیں میں کیلا تو نہیں، ہزاروں حسرتیں اس خلا میں تیری جیتی ہیں۔ یہ حسرتیں انسانی رگوں کے
 ٹکڑے ہیں۔ یہ زندہ ہیں، مجھے ان پر پیار آتا ہے اور میں انھیں اپنے پاس بلاتا ہوں۔ ہمدردی اور پیار
 کی بھوکی رگوں میں مجھے اپنے دل کا راز سننے لگتی ہیں۔ ان کی بات سن کر مجھے ایک غیر معمولی قوت کا
 احساس ہوتا ہے جیسے سیراز کوئی عظیم شے ابھری ہو۔ ادھر جی سی انجانی اور نئی بلندیوں کی طرف پرواز
 کرنا چاہتی ہو لیکن ایک گہرا اور مضبوط خول اس حسرت کی تکمیل میں مانع ہو۔

میں ہر روز یونہی سوچتا ہوں۔ یونہی خلا میں تیرتا ہوں اور یونہی محسوس کرتا ہوں لیکن آج صبح
 ان لڑکوں کی ہا ہوسے سارا ماحول جاگ اٹھا تو مجھے ہکا بکا ایک دھچکا محسوس ہو جیسے خول ٹوٹ
 گیا ہو۔ دی گھٹی انسانیت پھیل گئی ہو اور اس کی عظمت نئی بلندیوں کی طرف پرواز کر رہی ہو۔

تحریر

